ادب لطیف

★ عبادت

”حقیقت یہ ہے کہ ہمارا قدیم کلاسیکی ادب ہماری زندگی کی صحیح
اور سچی تاریخ ہے اس میں ہماری تاریخ کے تین سو سال کے سار
مد و جزر اور تمام نشیب و فراز کی کہانیاں موجود ہیں۔ اور اسمیں قدم قد
پر ہمیں زندگی کی آغوش میں افکار و خیالات، عقاید و نظریات، افتاد طب
اور ذہنی رجحانات کی تصویریں ملتی ہیں۔ اور وہ ان سب کا علمبردار ہے
ہمارا قدیم کلاسیکی ادب تاریخ کا صحیح آئینہ دار اور سماجی، معاشی او
ذہنی و فکری زندگی کا سچا اور پر خلوص ترجمان ہے“

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

ادب لطیف

چوہدری برکت علی، میرزا ادیب اور قتیل شفائی نے مرتب کیا

مکتبہ — اردو — لاہور

ترتیب

جون سنہ ۱۹۴۹ء

ماہنامہ ادب لطیف لاہور

شمارہ ۳

جلد ۲۸

فی کاپی — بارہ آنے

زرِ سالانہ — ۸ روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چوہدری برکت علی پرنٹر پبلشر چھپکر گنپت روڈ سے شائع ہوا

حرفِ اوّل

سالِ رواں کا سالنامہ کچھ ایسے حوصلہ شکن حالات میں شائع ہوا کہ ہمیں اپنی توقعات کی تکمیل میں شکوک وشبہات کو بھی شامل کرنا پڑا۔ لیکن جب سالنامہ چھپ کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچا تو ہمارے تمام تر وسوسے خیال وخواب ہو کے رہ گئے۔ جہاں سو پرچے بھیجے تھے۔ وہاں پچاس کی مزید مانگ پوری کرنا پڑی۔ جنہیں سالنامہ بھیجنے میں قدرے تاخیر ہوگئی۔ اُنھوں نے خط پر خط لکھ کر اپنے اشتیاق کا بے پناہ اظہار کیا۔ اور ہمیں فخر ہے کہ ہماری اس پیش کش نے ہمارے پڑھنے والوں کے اطمینان کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ادبِ لطیف کی روایات کے تقاضے ہماری موجودہ مساعی سے بہت زیادہ آگے ہیں۔ اور ہمارے پڑھنے والے ہم سے جدید ترین، معیاری، اور تعمیری ادب کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا علاج کیا کہ "لکھنے والے" کم اور "لکھانے والے" بہت زیادہ ہو چکے ہیں۔ اگر چند برس پہلے کسی مقام سے دو ایک پرچے بمشکل شائع ہوتے تھے تو آج وہاں سے درجنوں بلکہ بیسیوں جرائد صفیں باندھے نظر آتے ہیں اور لکھنے والے ہیں کہ لکھ لکھ کر چور ہو جانے کے باوجود کہیں معاشی مجبوریوں اور کہیں تعلقات کی بنا پر دن رات جبری تخلیق پر مجبور ہیں۔ چنانچہ اس مارا ماری میں جہاں بلند وپست کا امتیاز دھندلا پڑتا جا رہا ہے۔ وہاں بعض پرچے اچھے مضامین نہ ملنے کی وجہ سے آٹھ آٹھ دس دس ماہ تک چھپنے ہی نہیں پاتے، ایسے حالات میں اگر ایک آدھ چیز پڑھنے والوں کی توقعات سے ہم آہنگ نہ ہوئی ہو۔ تو ہمیں حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم نے کوشش کی ہے۔ کہ ادبِ لطیف کا ہر شمارہ پہلے شمارے سے بہتر ہو، اگر آپ کا خلوص ہمارا ساتھ دیتا رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مقاصد کی تکمیل نہ کر سکیں۔

ترقی پسند تحریک کی مخالفت پہلے بھی کی جاتی رہی ہے مگر چند دنوں سے تو بعض موقعہ پرست حلقے ترقی پسند مصنفین پر عجیب وغریب الزامات لگا رہے ہیں۔ اگر ان الزامات کے پس منظر سے آنکھیں بند نہ کر لی جائیں۔ تو ایک ایک حقیقت اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ترقی پسندوں کی مخالف صفوں میں آئے دن کی یہ غوغا آرائی محض شکست خوردگی کے احساس کا ردِّ عمل ہے۔ ورنہ ایک دنیا جانتی ہے۔ کہ ترقی پسند نہ تو فحاشی کے حامی ہیں اور نہ ہی انہیں کسی مذہب کے تقدس سے بیر ہے۔ اگر کوئی روزنامہ اپنی لاعلمی یا علمی کم مائیگی سے کسی انفرادیت پسند مصنف کی تصانیف کو ترقی پسند مصنفین کے سر منڈھ دیتا ہے۔ تو اس میں ترقی پسند ادیبوں کا کیا قصور ہے۔ اور اسی طرح کوئی اور اخبار یومِ مئی کی کارروائی میں کچھ مفروضہ باتوں کا اضافہ کر کے ترقی پسندوں کو گردن زدنی قرار دینے کی ناکام کوشش میں مگن ہے تو اس سے ترقی پسند تحریک کو کیا واسطہ — اگر صوبائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری احمد ندیم قاسمی کے مفصل بیان سے بھی معترضین کی تسلی نہیں ہو سکی۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمام تر شور وغوغا کسی سوچے سمجھے ہوئے لائحہ عمل کا نتیجہ ہے۔ اور اس پالیسی کی تشکیل میں انہیں رجعت پسند طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ جنہیں سرمائے اور حکومت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر چھاپہ مارنے کا چسکہ پڑا ہوا ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اگر ان سر پھرے نوجوانوں کے ہونٹوں کو سی نہ دیا گیا۔ تو ان کی زبانیں عوام کی سماعت سے براہِ راست مخاطب ہونے لگیں گی اور جب عوام میں سچی بیداری پیدا ہو گئی۔ تو جاہ پسند اور سرمایہ دار طبقے کی ساکھ خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کو مٹانے کیلئے کبھی تو انہیں روسی ایجنٹ کا خطاب دے کر عوام کو ان کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ اور کبھی فحش نویسی کے الزام سے انہیں رسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر کل تک انہیں لادین اور ملحد قرار دینے کے جتن کئے جاتے رہے۔ تو آج ان پر توہینِ رسالت کا بہتان لگایا جا رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی شرمناک حد تک غیر ذمہ دارانہ باتیں جہاں مخالف صفوں کے وقار میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کر سکتیں۔ وہاں ترقی پسند تحریک پر ان کھوکھلے حملوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہو گا۔ کہ چند دن تک بعض سادہ لوح انسانوں کو مذہب واخلاق کا نام لے کر گمراہ کیا جا سکیگا لیکن صداقت اور حقائق کبھی چھپے نہیں رہتے۔ جب عوام کو پتہ چل گیا۔ کہ درحقیقت قوم ووطن اور مذہب واخلاق کے دشمن کون ہیں۔ تو وہ ان

سنہری بدلیاں چھٹ جائیں گی۔ جنہوں نے آج عوام دشمن طاقتوں کے چہرے بڑی عیاری سے ڈھانپ رکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہماری ترقی پسند تحریک کو اپنی زندگی کے ہر دور میں بے پناہ مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اور رجعت پرست طاقتیں بیک وقت کئی محاذوں سے اس پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں اور برابر ہو رہی ہیں!! ادب میں ترقی پسندی کی تحریک — ایک عالمگیر ادبی تحریک ہے اور اصولی امر یہ ہے کہ ایک ادبی تحریک کا جائزہ صرف ادبی نقطۂ نظر ہی سے لیا جائے۔ مگر اس محاذ پر ترقی دشمن قوتیں جم کر مقابلہ نہیں کر سکیں — وہ مقابلہ کر ہی نہیں سکتیں کیونکہ آج یہ قوتیں کسی اشارۂ غیبی کی تائید میں اپنے سب سے بڑے، سب سے طاقتور اور سب سے مضبوط محاذ — مذہب کے قلعے میں بند ہو کر شرمناک الزامات کے زہر آلود تیر پھینک رہی ہیں۔ یہ حملہ سب سے خوفناک حملہ ہے — اور عوام اور ترقی پسندوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنے کی یہ آخری متحدہ کوشش ہے زوال آمادہ قوتوں کو اس محاذ سے بڑھ کر موزوں اور محفوظ محاذ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے تمام بکھرے پڑے اجزا اسمیٹ کر اسی محاذ پر جم کر سخت جانی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

ایک لمحے کیلئے غور کیجئے کہ جن نوجوانوں نے اپنی زندگی ایک وہم پرست ماحول میں گزاری ہو آج اگر وہ ان توہمات کے خلاف جد و جہد کرتے ہیں۔ تو کیا یہ مذہب کے خلاف جہاد ہے۔ کیا یہ توہین رسالت ہے۔ ایسا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا! وقت کے حقیر ترین قصے کے لئے بھی ممکن نہیں ہو سکتا ہر ترقی پسند مصنف کا واحد نصب العین یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ذہنی فکر و کاوش سے ایک عالمگیر معاشی انقلاب کے لئے فضا سازگار کرے۔ معاشی انقلاب — مذہبی انقلاب نہیں۔ کیونکہ معاشی انقلاب کے بغیر وہ کروڑوں بھوکے ننگے انسان، جنہیں ہم عوام کہتے ہیں کبھی زندگی کی اس بلند سطح پر نہیں آ سکتے۔ جس بلند سطح پر آنا بہ حیثیت انسان ان کا بنیادی حق ہے۔

اور ترقی پسند گروہ اپنے محبوب عوام کے اسی بنیادی حق کے لئے قلمی جد و جہد کر رہا ہے۔ اور جو لوگ اس قلمی جد و جہد سے ہراساں ہیں — جو قوتیں اس جد و جہد کو اپنے حق میں موت کا پروانہ سمجھ رہی ہیں — وہ ترقی پسندوں کے خلاف ہر وہ ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو دم توڑتے ہوئے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے ان کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔

ترقی پسند مصنف عوام سے صرف ایک بات کہتا ہے — صرف ایک بات۔

"اپنے حقیقی دشمن کو پہچانو۔ اور اس کی خطرناک چالوں سے بچو"

گزشتہ شمارے میں اردو اکیڈیمی کی اس تجویز کا ذکر کیا گیا تھا۔ جو ادبی دنیا کے ایڈیٹر جناب صلاح الدین احمد صاحب نے حکومت مغربی کی خدمت میں پیش کی ہے۔ ظاہر ہے ہمارے ہاں اکیڈیمی کا کوئی واضح اور غیر مبہم تصور موجود نہیں تھا۔ اور مولانا نے سٹیٹ اکیڈیمی کی جو مکمل تجویز پیش کی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ جہاں تک اس سکیم کا تعلق ہے۔ اردو سے محبت کرنے والا کوئی شخص بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ مگر ہم شروع ہی سے اس امر کے مخالف تھے۔ کہ اس کار آمد اور مفید سکیم کو حکومت کی خدمت میں پیش کیا جائے، کیونکہ کوئی حکومت بھی، جب تک وہ صحیح معنوں میں عوامی حکومت نہ ہو، کسی سکیم کو اپنے مخصوص اغراض سے علیحدہ نہیں رکھ سکتی۔ اسلئے ہم چاہتے تھے کہ حکومت کی بجائے اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والی ہستیاں خود اس کام کا بیڑا اٹھائیں۔ اور اس تجربہ کو عملی صورت دیں۔

ہمیں مسرت ہے، کہ مولانا نے حکومت سے مایوس ہو کر چند باہمت شرکائے کار کے ساتھ اس شاندار کام کو شروع کر دیا ہے۔ ہمیں کامل امید ہے۔ کہ ادب دوست لوگ خود اپنی جواں ہمتی سے اردو اکیڈیمی کے تمام تصورات کو جلد سے جلد مادی صورت میں پیش کر دینگے۔

اس شمارے میں قمر اجنالوی کی ایک طویل نظم شامل کی جا رہی ہے۔ جو قمر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک اجلاس میں پیش کی تھی۔ یہ نظم اگرچہ نظر ثانی کے بغیر اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ لیکن اسکے باوجود نظم کے مجموعی تاثر کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس نظم کے بعد بعض دیگر شعرا نے طویل نظم کو اپنا لیا۔ اور اس طرح دو ایک ایسی نظمیں بھی تخلیق ہوئیں۔ جنہیں ہم ترقی پسند ادب کے لئے بہت مفید کہہ سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی

تنقیدی جھلکیاں

جی چاہتا ہے کہ آج میں قدامت پرستی اور کلاسکیت کے بارے میں آپ سے کچھ باتیں کروں!

شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی۔ کہ میں ترقی پسند ہونے کے باوجود ایک بہت بڑا قدامت پرست اور کلاسیکی ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر سچے اور پُر خلوص ترقی پسند ادیب کو قدامت پرست اور کلاسیکی ہونا چاہیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ مجھے یقین ہے کہ ہر سچا اور پُر خلوص ترقی پسند ادیب قدامت پرست اور کلاسیکی ہوتا ہے۔ قدامت پرست ہوئے بغیر اس کا فن صحیح معنوں میں فن ہو ہی نہیں سکتا۔ بغیر قدامت پرستی اور کلاسکیت کے اسکے فن میں جان پیدا ہوتی مشکل ہے۔ اس کو قدامت پرست اور کلاسیکی ہونا پڑتا ہے۔ وہ اگر اس سے پیچھا چھڑانا بھی چاہے، تب بھی ایسا ممکن نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ قدامت پرستی اور کلاسکیت اسکے فن میں زندگی کی بجلیاں بھرتی ہے۔ اسی قدامت پرستی اور کلاسکیت کے ہاتھوں اس کے فن میں سحرکاری کے نت نئے اور رنگارنگ پھول کھلتے ہیں۔ اسی قدامت پرستی اور کلاسکیت کے طفیل میں اسکے فن کا سانس آسمانوں پر چمکتے ہوئے تاروں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے —— اور میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ ادب اور فن میں یہی قدامت پرستی اور کلاسکیت اسے جدت کی راہوں پر چلاتی ہے۔ فن کی نئی منزلوں سے روشناس کرتی ہے، اور اسی کے باعث اس کے فن کی رگ رگ میں نیا خون موجیں مارنے لگتا ہے۔ اور نئے ولولے انگڑائیاں لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

قدامت پرستی سے یہاں میری مراد ادبی اور فنی قدامت پرستی ہے —— جس کو تنقید کی اصطلاح میں روایت پرستی بھی کہہ سکتے ہیں —— اپنی ادبی و فنی روایات سے آج تک تو کوئی سچا فنکار یا ادیب چشم پوشی کر نہ سکا۔ اور جنہوں نے اس کو نظرانداز کرنے کی شعوری کوشش کی۔ وہ بیچارے ادب اور فن کی دنیا میں جنگلیوں اور وحشیوں کا روپ اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اور اُنہوں نے اپنے فنون کو زندگی اور اس کی سحرکاریوں سے محروم کر لیا —— ایسے فنکاروں کی آج دنیا میں کوئی وقعت نہیں۔ ان کی حیثیت کاغذ کے پھولوں کی سی ہے، جن کے رنگ خوشنما اور دیدہ زیب ہوتے ہیں، لیکن سچ مچ کے پھولوں کی سی رنگت، تازگی، لطافت، نرمی اور خوشبو ان میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ ادب اور فن کی جڑیں روایات کی زمین میں دور تک پھیلی ہوتی ہیں —— اسلئے ان سے قطع تعلق کر لینا اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار لینے کا مصداق ہے۔

اُردو کے آج تمام صحیح، سچے اور سلجھے ہوئے ترقی پسند ادیب اپنی روایات کا احترام کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے قدیم کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ اب بھی بعض ایسے موجود ہیں۔ جو قدیم کلاسیکی ادب کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک وہ ذرا بھی درخور اعتنا نہیں، کیونکہ ان کے خیال میں وہ ایک خاص طبقے اور مخصوص ماحول کی پیداوار ہے۔ اسلئے آج کی دنیا میں جدید فن کار کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پہلے اس قسم کے خیالات میں جذباتیت تھی، لیکن اب نئے ادیبوں کی تن آسانی بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ ایسے نئے ادیب قدیم کلاسیکی ادب کو پڑھنے کے لئے محنت نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی بہت سی خوبیاں ان کی نظروں کے سامنے بے نقاب نہیں ہو پاتیں۔ وہ انہیں محض جھوٹ اور لایعنی مبالغے کی پوٹ نظر آتا ہے۔ اس لئے ان کے خیال میں اس کو نذر آتش کر دینا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ قدیم کلاسیکی ادب جس کے سہارے ہماری ادبی روایات زندہ ہیں۔ وہ صرف جھوٹ، مبالغہ اور لایعنی باتوں کا بیان ہی نہیں ہے، اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے۔ جو کسی اچھے، صحت مند اور بلند مرتبہ ادب میں ہونا چاہیئے —— یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک مخصوص سماجی

ماحول میں پیدا ہوا ہے۔ مخصوص افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کے لوگوں کے ہاتھوں اس کی تخلیق ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے اندر جو آفاقیت ہے، سماجی ماحول کی جو ترجمانی ہے، زندگی کے عام رجحانات کی جو عکاسی ہے، بدلتے ہوئے حالات کی جو تصویریں ہیں، زندگی کی بنیادی باتوں کا جو تذکرہ ہے، ان سب نے اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ پر منفرد نظر آتا ہے۔

ہمارے قدیم کلاسیکی ادب میں، بے شک، بہت سی خامیاں بھی ہیں، لیکن خامیاں کس دور کے ادب میں نہیں ہوتیں؟ قدیم کلاسیکی ادب کی خامیوں سے کسی کو انکار نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے اندر جو خوبیاں ہیں۔ ان سے جب جان بوجھ کر، یا کسی غلط فہمی کی بنا پر چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اس سے یقیناً دل کو دکھ ہوتا ہے۔ بعض نئے لکھنے والے تو سرے سے قدیم ادب کو پڑھتے ہی نہیں اور بغیر پڑھے ہوئے ہی یہ رائے قائم کر لیتے ہیں، کہ قدیم ادب چونکہ جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوا ہے اسلئے اس میں جاگیردارانہ عہد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے خیال میں اس کا پڑھنا اپنے آپ کو گمراہ کرنا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے خیالات صرف جذباتیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر کسی مخصوص ماحول ہی میں پیدا ہونے سے وہ ادب ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، تو آجکل کے جدید ادب کو سمجھنے میں بھی بڑی دشواریاں اور بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر دور کے ادب میں اس دور کی خصوصیات ضرور جھلکتی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس زمانے کے لکھنے والوں کا سماج اور زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ حالات اور ماحول کو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لکھنے والوں کا تعلق ایک خاص طبقے سے ہوتا ہے، اسلئے وہ اس کی ترجمانی کرنے کے لئے بڑی حد تک مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہر دور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم کے ادبیات میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جو آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ اور جن میں ایک رشتۂ اشتراک ہوتا ہے۔ اس رشتۂ اشتراک کو رہتی دنیا تک کوئی نہیں توڑ سکتا۔ کیونکہ اس کی تعمیر انسانیت اور انسانی فطرت کی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ کیا کیا جائے کہ جاگیردارانہ دور کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے ادب کے اندر بھی ان خصوصیات کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جاگیردارانہ دور کا مسموم ماحول اور اس کی انسانیت سوز فتنہ کی افراتفری اور انتشار تسلیم، لیکن اس ماحول میں بھی انسان رہتے ہی ہیں۔ ان کے دلوں میں جذبات و احساسات کی لہریں اٹھتی ہی ہیں ―― اور یہ جذبات و احساسات بھی بنیادی جذبات و احساسات، جو انسان کے دم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ جن کو زمانے کا کوئی انقلاب نہیں مٹا سکتا۔

مثال کے طور پر حسن پرستی ہی کو لیجئے۔ انسان حسن سے متاثر ہوتا رہے گا۔ پہاڑوں کا شان و شکوہ، دریاؤں کی روانی کی پُرشور موسیقی، ٹھنڈی ہواؤں کا خرام، خمار انگیز ستاروں کی بزم سحر آفریں، چاندنی کا گل ریز تبسم، مصر راگ گاتی ہوئی برسات کی رنگینیاں، ہنستی اور مسکراتی ہوئی شفق کی سحر کاریاں، طرح طرح کے پھول بکھیرتی ہوئی بہاروں کی رعنائیاں، سبزہ زاروں کی سرمستیاں، سمن زاروں کی فسوں سامانیاں، ―― اور پھر انسانی حسن کا کیف و سرور ―― صنفِ لطیف کے رنگ روپ کا جادو، جوانی کی افسوں گری، خرامِ ناز کی نغمگی، عشوہ و ناز و ادا کی سحر کاری، جسم کے ایک ایک عضو کی قیامت آفرینی ―― اور ان سب کے جلو میں پرورش پائی ہوئی محبت، عشق اور اس کی مختلف کیفیات، عشق اور اس کی مختلف منزلیں، ان سب سے انسان کس طرح دامن بچا سکتا ہے۔ انسان ان کو کسی حالت، کسی ماحول اور کسی نظام میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اور پھر ان کے ساتھ ساتھ رنج و غم اور خوشی و مسرت، اداسیاں اور طرب ناکیاں، مصیبت اور راحتیں، پریشانی اور سکون و اطمینان یہ سب رہتی دنیا تک ہر دور، اور ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم ہر فضا اور ہر ماحول کے انسان کے دم کے ساتھ رہیں گی۔ جو ادب ان تمام موضوعات کا عکاس اور ترجمان ہوگا، اس کی دنیا میں کبھی بھی خزاں کی بادِ سموم کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہر زمانے اور ہر عہد کے افراد اسے کلیجے سے لگا کر رکھیں گے۔ وہ سینہ بہ سینہ رہتی دنیا تک ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے گا۔ اور انہیں اس آئینے میں ہمیشہ ہمیشہ اپنی تصویریں نظر آتی رہیں گی۔

دنیا جہاں کے قدیم کلاسیکی ادبیات کی یہی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے۔ جو انہیں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ ہر ملک کا قدیم کلاسیکی ادب انہی خصوصیات کے باعث انسانیت کا گراں بہا سرمایہ بن جاتا ہے۔ ہمارے قدیم کلاسیکی ادب میں بھی یہی خصوصیات غالب ہیں۔ اُسی وجہ سے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ― اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دلکشی میں کبھی بھی کمی نہیں ہو سکتی ―― وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اُس کی آب و تاب کے ستارے کبھی بھی ماند نہیں پڑ سکتے۔ البتہ اس سے دلچسپی نہ لینے والوں کے لئے ہلاکت کے گڑھے میں گرنا یقینی ہے۔

اردو کے قدیم کلاسیکی ادب میں اسی خصوصیت کا رنگ سب رنگوں سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ یا اس میں حسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیات انسانی رنج و غم اور سکون و مسرت، زندگی کے خارجی مظاہر کے داخلی نقشے، انسانی نفسیات کی اصلیت و حقیقت کے رنگ میں رنگی ہوئی تصویریں — یہ سب بڑی ہی چابکدستی سے بے نقاب کی گئی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا ادب دنیا کے ادبیات میں ایک بلند مرتبے کا مالک بن گیا ہے۔ ہمارے قدیم کلاسیکی شاعروں نے زندگی کے عرش سے کیسے کیسے تارے توڑے ہیں۔ حسن اور خوبصورتی کے بیان کے سلسلے میں انہیں کہاں کہاں پہونچنا پڑا ہے، کیسی کیسی منزلیں مارنی پڑی ہیں۔ قلی قطب شاہ سے لیکر ولی سراج، میر، سودا، درد، مصحفی، غالب، مومن، داغ اور اسکے بعد تک کے شاعروں کے ہاں شاید ہی ان موضوعات کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو ہو جو نظر نہ آتا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ سب کے سب اپنے اپنے وقت اور ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان سب کا اپنی اپنی ایک منفرد افتادِ طبع ہے۔ ان کے انداز اور طرزِ ادا میں فرق ہے۔ لیکن ان موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کے یہاں ایک آفاقی کشش اور ایک کائناتی دل موہ لینے والے انداز کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب حسن کے نقشے، مختلف زاویوں سے کھینچے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں عشق و محبت اور اس کی مختلف کیفیات کی ایسی تصویروں کی تخلیق ہوتی ہے جس میں انسانی رنگ جھلکتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ آپ بیتی، جگ بیتی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان بڑی حد تک روایتی ہوتا ہے۔ وہ کہیں قیس کی جنوں سامانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہیں فرہاد کی کوہ کنی کی داستانیں سناتے ہیں، کہیں گل و بلبل، قفس، و آشیانہ، دام و صیاد، مے و میخانہ، اور شیشہ و پیمانہ کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان سب میں وہ حقیقتیں بو۔ گر ہوتی ہیں۔ وہ ان پردوں میں چھپا کر اپنی باتیں کہنے کے لئے مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ خود اور وہ افراد جن کے لئے انہوں نے یہ سب کچھ پیش کیا ہے، سب کے سب ان چیزوں میں مطالب و معانی کی دنیائیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے صدیوں سے ان چیزوں کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کو وابستہ کر رکھا تھا۔ اور آج تک ان کے اثرات کم نہیں ہو سکے ہیں۔ موجودہ نسل تک ان کے اثرات سے بچ نہیں سکی ہے۔ کیونکہ جذبات و احساسات بہر حال آج بھی روایتی علامات و اشارات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قدیم کلاسیکی شاعروں کے اس اندازِ بیان اور اسلوب سے بدظن ہونے کی ضرورت نہیں — ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام بدگمانیوں کو خیرباد کہہ کر اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ انہوں نے اس طرزِ ادا میں کیسی چابکدستی سے کام لیا ہے، اور اسکے دو شانوں میں لپیٹ کر معانی و خیال اور احساسات و کیفیات کے کیسے کیسے حسین پیکر پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر "کرشمہ دامنِ دل" کھینچتا ہے۔ اور "سراپا" میں جس جگہ بھی نظر کیجئے وہیں اپنی عمر بسر کر دینے کی تمنا دل میں انگڑائیاں سی لینے لگتی ہے۔

قدیم دکنی شاعروں سے لے کر متاخرین تک کے یہاں یہی خصوصیات کا احساس ہوتا ہے۔ بلکہ موجودہ دور کے کلاسیکی انداز میں کہنے والے شاعروں کے یہاں بھی یہی خصوصیت ملتی ہے۔ وہ سب کے سب اس اعتبار سے زندہ جاوید ہیں۔

دکن کے قدیم شاعروں میں اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اس وقت کی زبان میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں، جو بہت ممکن ہے صرف اس وجہ سے ہمارے لئے دلچسپی کا باعث نہ بن سکیں کہ وہ زبان ہماری زبان نہیں۔ لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد جب زبان سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ یا جہاں کہیں وہ ہماری زبان سے ملتی ہوئی صاف اور سادہ زبان میں لکھتے ہیں۔ تو ایک ایک شعر پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، وجہی، ابن نشاطی، غواصی اور نصرتی وغیرہ نے اپنی تخلیقات میں کیا کچھ نہیں کر دیا ہے — یہ تو خیر بڑے شاعر ہیں۔ بعض معمولی درجے کے شاعروں کے کلام میں زندگی کے موضوعات کی ایسی بجلیاں بھی نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں کا خیرہ ہو جانا یقینی ہے — ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ اور یہ ہم سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ حسن کے کیسے شیدائی تھے۔ زندگی کا کتنا شدید احساس ان شاعروں کے اندر موجود تھا۔ ان کے افکار و خیالات میں کیسی آفاقیت تھی۔ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں وہ کس قدر چابکدستی سے کام لیتے تھے اور ان سب کو فنی رنگ دینے میں انہیں کس درجہ کمال حاصل تھا۔

محمد قلی قطب شاہ اس زمانے کا مشہور شاعر ہے، جس نے اپنا کلیات بھی مرتب کیا ہے۔ مختلف النوع موضوعات پر اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حسن و عشق کے موضوعات کو خصوصیت کے ساتھ جس طرح اس نے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اور جس پر رہتی دنیا تک پڑھنے والے سر دھنتے رہینگے، پہلے غزلوں کے چند اشعار دیکھئے:-

سو لادیں گے تو ناسو سوا اٹھونگی وانتے یوں کہکر
جیوں خوں واخوشی میری میں ہو ہوشیار بیٹھوں گی

ایک معصوم عورت کے جذبات و احساسات کی کیسی سچی تصویر ہاشمی نے پیش کر دی ہے۔ آج اور آئندہ بھی ہمیشہ ہمیشہ ان منزلوں سے ہر عورت گزرتی رہے گی۔ چاہے وہ زمانے کے ساتھ کتنی ہی کیوں نہ بدل جائے۔

دکن کے ان شاعروں کی زبان ذرا مشکل اور ہمارے لئے نامانوس ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات کی حقیقت و حقیقت ہمارا دل موہ لیتی ہے۔ ان شاعروں کے بعد دکن کے آخری دور میں جب زبان آسان ہو جاتی ہے۔ تو حسن و عشق اور اُس کی مختلف کیفیات کے بیان میں کچھ اور بھی گرویدہ کرنے والا انداز پیدا ہو جاتا ہے — ولی کے زمانے تک آتے آتے یہ تبدیلی ہو جاتی ہے — اور ولی کی شاعری میں اور بھی لطف آتا ہے۔ وہ ہمیں آج کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ ولی حقیقتاً ایک حسن پرست شاعر تھا۔ چنانچہ اپنی شاعری میں اس نے خارجی حسن کی مصوری نہایت چابک دستی کے ساتھ کی ہے۔ اس کی یہ غزل —

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا　　ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نیں ہے مرا واقف　　اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں　　ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے　　یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر میری ساری　　اے بت کی پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت　　یک بار اری موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم!
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

بھلا کس کو پسند نہیں آئے گی — کون ہے جو اس میں خود اپنے محبوب کی تصویر نہیں دیکھے گا — ولی کی ساری شاعری اسی طرح کے بیان حسن اور ساتھ ہی حسن و عشق کی دوسری کیفیات کی ترجمانی سے بھری پڑی ہے —

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو　　کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی!

آشنائی نہیں تو جاتا ہوں　　کیا کروں جی اداس ہوتا ہے۔

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب
تب سوں رہے خیال میں دل میں عجب عجب

عشق کی راہ میں مسافر کوں　　ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

دو جگ ہوئے ہیں دل سے فراموش اے ولی　　رکھتے ہیں یاد جب سے سریجن کی من میں ہم

سجن تم کھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ　　کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر　　ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ
سلونے سانولے بیتیم تری موتی کی جھلکاں نے　　کیا عقد ثریا کو خراب آہستہ آہستہ

یک بار گی ہو ظاہر لے تابیٔ مشتاقاں　　جس وقت کہ غمزے سوں چھاتی کو چھپاوے توں

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن　　باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا　　ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا

مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خوبی　　تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

ان تمام اشعار میں آفاقیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہر دور اور ہر زمانے کے انسانوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ ان کی آب و تاب کبھی بھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ ان میں انسان کے بنیادی جذبات و احساسات کی ترجمانی نے ایک ایسی چمک پیدا کر دی ہے، جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

ولیؔ کے بعد تو ایسے بے شمار شاعر ہمارے ادب میں نظر آتے ہیں، لیکن ان میں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ و مومنؔ کو —! ان شاعروں نے انسانی نفسیات اور جذبات و احساسات کی درحقیقت وہ واقعیت سے ہم آہنگ بڑی ہی دلآویز تصویریں پیش کی ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ خود زندۂ جاوید ہیں۔

میرؔ بھی حسن و عشق کا شاعر ہے　اور عشق عام طور پر ناکام ہی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرؔ کے یہاں حسن و عشق رنج و غم کی کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ ان میں ایک آفاقیت پائی جاتی ہے۔ میرؔ کا غم اگرچہ بہت ہی شدید ہے۔ اور اس میں یہ شدت بڑی حد تک میرؔ کی افتادِ طبع کا بھی نتیجہ ہے۔ لیکن اسکے باوجود اسکے اشعار میں جن جذبات و احساسات کا بیان ہے، وہ انسان پر گزرے ہوئے حالات و واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ عشق کا سرچشمہ چونکہ عام طور پر حسن ہی ہوتا ہے۔ اسلئے حسن کے مختلف پہلوؤں کی تصویرکشی بھی میرؔ کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن حقیقتاً میرؔ عشق کے نتیجے میں پیدا شدہ مختلف جذبات و احساسات اور واردات و کیفیات کا شاعر ہے، اور یہ واردات و کیفیات ایسی ہیں جو عاشقی میں ہر انسان پر گزر سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے میرؔ کی شاعری میں رس ہے، رعنائی ہے، ایک ایسا دل موہ لینے والا انداز ہے۔ جو کبھی ہمیں نہیں مل سکتا۔ ؎

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں　تے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ　مذہب عشق اختیار کیا!

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا　جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

مصائب لاکھ بھتے پر جی کا جانا　عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی ہے

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھوں میں لے کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا!

ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب　یعنی اک بات سی بنائی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا　داغ ہوں اسکی بے حجابی سے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس نے شوخ　اک حرف نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ　ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

لینے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

گل شرم سے بہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

زلفوں کو ہیں چھوا سو غصے ہوئے کھڑے ہو
یہ بات ایسی کیا ہے جس پر الجھ پڑے ہو

پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے وہ احوال
رہ جاتے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

اس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

جس دن کہ اسکے رخ سے برقع اٹھیگا سنیو
اس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا

شب کو گلے لگا ہوا سوتا تھا خواب میں
بخت اپنے سو گئے کہ جو بیدار ہو گئے

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

ناز کی کوئی یہ بھی کھٹک ہے جی کاہے کو کڑھاتے ہو
آتے ہو تمکیں سے ایسے جیسے کہیں کو جاتے ہو

پردہ ہم سے کر لیتے ہو جب آتے ہو مجلس میں
آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم ہی سے شرماتے ہو

بلا معزور ہے وہ آتشیں خو
بہت منت کرو تو جی جلاوے

پڑا نظر پاکیا میں دو پہر دن
عجب کیا ہے جو پاس اپنے بلاوے

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یونہی گزرے صبح و شام بتاتے ہو

ٹک منہ سے اسکے دلیشب برقع سرک گیا تھا
جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

جلوۂ ماہ تا اثر تک بھول گیا
اس نے سوتے میں دوپٹے سے جو منہ کو ڈھانکا

ان اشعار میں جن جذبات و احساسات اور واردات و کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے، کیا وہ کبھی بھی پرانے ہو سکتے ہیں؟ کیا کبھی بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو متاثر نہ کریں۔ جب تک دنیا میں حسن اور اس کی سحر کاریاں موجود ہیں، عشق اور اسکی جنوں سامانیاں موجود ہیں، معشوق اور اس کی جلوہ طرازیوں کا وجود ہے، عاشق اور اس کی ماتم گساریوں کا وجود ہے —— جب تک زندگی میں یہ کھیل کھیلا جاتا رہے گا۔ اور یقیناً ہمیشہ ہمیشہ کھیلا جاتا رہے گا، — اس وقت تک ان اشعار کی دلکشی اور دلآویزی کم نہیں ہو سکتی —— جب تک انسان زندہ ہے یہ زندہ رہیں گے۔

میر کے ہمعصر سودا کا یہ دیوان تو نہیں جو میر کا ہے، کیونکہ میر کی طرح وہ حسن و عشق میں ڈوبے ہوئے نہیں تھے۔ اور دوسرے انہوں نے اپنی شاعری کے دائرے کو وسیع بھی کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی عشقیہ شاعری کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے اشعار میر کے اشعار کی طرح رنج و غم میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کو ہنس کر، اس سے دلچسپی لے کر گزار دینے والا انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک لالہ زار کی سی خصوصیت نظر آتی ہے، لیکن ان کی شاعری کے اس رنگ میں بھی آفاقیت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ زندگی صرف رنج و غم ہی سے عبارت نہیں ہے۔ اس میں مسکراہٹ بھی ہے۔ قہقہے بھی ہیں زندگی کو زندگی سمجھ کر بسر کرنے کا خیال بھی ہے۔ سودا کا عشقیہ شاعری میں یہی خصوصیات ملتی ہیں ؎

وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ رلیاں دیکھیاں

بے اختیار منہ سے نکلے ہے نام تیرا
کرتا ہوں جب کسی کو پیارے خطاب تجھ بن

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے
دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

شمع سے دور رہنے کو ہر چند
کہو پروانہ کو نہ سمجھے گا!

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

تھا کس کے دل کو کشمکش عشق کا دماغ
یارب برا ہو دیدۂ خانہ خراب کا

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھاؤ
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہو لے

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

فکر معاش عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوت محبوب خوب رو
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

بوسۂ رخسار کا وعدہ کیا کس سے وفا
کان کا موتی نانک تیرے لٹکتا ہی رہا

جب بزم میں بتاں کی وہ رشک مہ گیا تھا
آپس میں ہر پری رو منہ دیکھ رہ گیا تھا

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

یارو وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا
نظروں میں سو طرح کی حکایات ہو گئیں

گل ہے عاشق ترا قسم مت کھا
یوں نگریا بی کسی کا چھٹتا ہے

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا اک لپٹتا ہے

بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اس آفت جاں کو
اور دیکھنے دوں میں نہ زمیں کو نہ زماں کو

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

کیونکر نہ ہو مشبک پتھر سا دل ہمارا
اس شوخ کی نگاہیں پتھر میں ٹنکیاں ہیں

سودا کے یہ اشعار بھی میر کے اشعار کی طرح مر نہیں سکتے۔ ان میں ہمیشہ زندگی کی تازگی باقی رہے گی۔ کیونکہ یہ بھی انسان کے بنیادی جذبات و احساسات کے ترجمان ہیں۔ ان میں بھی انسان کے قہقہے ہیں۔ اسکے خون کی گرمی ہے۔ اس کی خوشی ہے، اس کی مسرت ہے۔ اس کی زندگی کے افق پر چھائی ہوئی رنگینیاں ہیں، رعنائیاں ہیں۔ غرض یہ کہ وہ سب کچھ موجود ہے۔ جو ایک انسان کے دل پر گزرتی ہے —— اور جو ہمیشہ ہمیشہ رہتی دنیا تک گزرتی رہے گی۔ اسی میں ان کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔

سودا اور میر کے بعد آنے والے غزلگو عشقیہ شاعروں میں غالب و مومن کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جنھوں نے اردو کی عشقیہ شاعری، خصوصاً غزل کی عشقیہ شاعری کو حقیقت و واقعیت کا ایسا رنگ دیا۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی آفاقیت سے ہمکنار ہو گئی ہے۔ اور اس میں ایک انسانی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

غالب نے روایتی انداز کو چھوڑ کر اردو غزل کو اپنی افتاد طبع کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اور جس عشق کا تصور پیش کیا ہے، وہ انسانیت سے ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ اس میں جنسی رنگ کی آمیزش ہے —— بلکہ ان کے عشق کی ساری بنیادیں جنسیات ہی پر استوار ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ جنسیات انسان کی زندگی میں

بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ صنفِ لطیف سے اس قدر دلچسپی لینے کا باعث اسکے سوا اور کچھ نہیں۔ غالب نے اس موضوع اور اس کے متعلقات کو اپنی عشقیہ شاعری میں سمویا ہے

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال　　صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو　　سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو　　انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ　　کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہئے"　　تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے　　روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہئے

کبھی نیکی بھی اسکے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے　　جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر　　محشرستانِ بے قراری ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار　　مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

نیند اس کی ہے، دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں　　تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

جن خیالات کو مذکورہ بالا اشعار میں غالب نے پیش کیا ہے، ان کا اثر ہر انسان پر ہونا یقینی ہے، کیونکہ وہ بھی ان کے بنیادی جذبات و احساسات سے متعلق ہیں زندگی میں ہر انسان ان کیفیات کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ انسان صدیوں پہلے سے ان کیفیات کی منزلوں سے گزرتے رہے ہیں آج بھی گزر رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی صدیوں بعد تک انہیں منزلوں سے گزرتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی وجہ سے غالب کے ان اشعار کا اثر کبھی بھی کم نہ ہوگا — وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیونکہ ان میں بھی آفاقیت موجود ہے۔

غالب کے ساتھ ساتھ مومن کی شاعری میں بھی ہمیں یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔ مومن کی ساری شاعری تمام تر دنیاوی حسن و عشق کی شاعری ہے۔ غالب کے یہاں حسن و عشق کے بیان میں بھی کہیں کہیں جو ایک غور و تفکر اور سوچ بچار کے پہلو نظر آجاتے۔ ان کا بھی مومن کے یہاں پتہ نہیں ملتا۔ مومن زندگی بسر کرنا جانتا ہے اور اُس زندگی میں کھل کھیلنا چاہتا ہے۔ اس نے بھی محبت کی ہے، اور وہ بھی اس کی مختلف کیفیات کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اس کے یہاں عشق و محبت سے زیادہ سے زیادہ حظ حاصل کرنے کی خواہش نظر آتی ہے، زیادہ سے زیادہ اُسے نچوڑ لینے کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انسانی نفسیات کے عین

مطابق ہے ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنشیں! نزاکت آواز دیکھنا!

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینے کو
کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

بے رحمئے قتل ابر نہ کھلا غبار دل
کہتے تھے انکو برق تبسم ہنسی سے ہم

اپنے آواز قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو
مڑ کے پیچھے دیکھ لے تھا ہر قدم پر رات کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیئے ستانے کو

کہنا پڑا مجھے پئے الزام بند گو
وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
اس کی نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

اس بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے!
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں!

خون کیونکر مرا کھلے کہ مجھے
اک سراپا حجاب نے مارا

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھے فکر جواب نے مارا

یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں
تیرے عہد شباب نے مارا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہے ہے تمیز عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

بسکہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں
موت سے آئے ہے حجاب ہمیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

زندگی میں حظ حاصل کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ مومن اس کا قائل ہے۔ چنانچہ ان اشعار میں اس بنیادی خیال کی لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس بنیادی خیال کی ترجمانی کے باعث مومن کی شاعری ایک عام انسان کی نفسیات اور فطرت سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت نے اسکے اندر بھی آفاقیت کا رنگ بھرا ہے — اور یہی وجہ ہے کہ وہ عام انسانوں کی دلچسپی کا باعث بنی۔ کیونکہ اس میں خود ان کے جذبات و احساسات کی تصویریں موجود ہیں — عام انسان اور ان کے یہ بنیادی جذبات و احساسات امر ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ چنانچہ مومن کی شاعری کا بھی زندۂ جاوید ہونا یقینی ہے۔

اردو شاعری میں ان آفاقی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا بیان چند سطروں میں بھی ہو سکتا تھا۔ اور بغیر انتخابات پیش کئے ہوئے بھی بات کہی جا سکتی تھی۔ لیکن اس تفصیل کو ضروری اس وجہ سے سمجھا گیا کہ اس کی صحیح اہمیت کا احساس ہو۔ اور وہ لوگ جو قدیم کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ انہیں اسکی خصوصیات کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو جائے۔

قدیم کلاسیکی ادب کی اس خصوصیت کو ذہن نشین کرانے کے سلسلے میں میں نے غزل کو خاص طور پہ پیش نظر رکھا ہے۔ اور ساری مثالیں غزلیات ہی کے

اشعار سے وہی ہیں۔ کیونکہ غزل کی صنفِ سخن نئے لکھنے والوں میں خاصی بدنام ہے۔ ان میں سے اکثر اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ خیالات صرف غزل ہی تک محدود نہیں ہیں۔ مثنویوں میں بھی ان کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن چونکہ غزل اس قسم کے خیالات کیلئے سب سے زیادہ مناسب سمجھی گئی —— اور اپنی ہیئت و تکنیک کے اعتبار سے حقیقتاً تھی بھی اسلئے اُردو کے قدیم کلاسیکی ادب کا بہت بڑا سرمایہ اسی صنفِ سخن کے سینے میں محفوظ ہے —— بہر حال یہاں غزل کی صنفِ سخن کے فنی پہلوؤں سے بحث نہیں —— دیکھنا یہ تھا کہ اسکے دامن میں معانی و خیال کے کیسے اور کتنے پھول کھلے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ حقیقت پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

ہمارے قدیم کلاسیکی ادب میں آفاقیت کی یہ خصوصیت صرف میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ ہی کی تخلیقات میں نہیں ملتی بلکہ تمام شاعروں کے یہاں اس کا احساس ہوتا ہے —— بعض تو بالکل معمولی درجے کے شاعروں نے ایسے اشعار کہہ دیئے ہیں۔ جنہوں نے لوگوں کی زبانوں پر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ان آفاقی جذبات و احساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ہمارے قدیم کلاسیکی ادب میں مختلف زمانوں کے ماحول، فضا اور حالات و واقعات کی ترجمانی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور سماجی زندگی کی عکاسی پوری طرح نظر آتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سماجی زندگی کی اس عکاسی میں ایک مخصوص زاویہ نظر ملتا ہے۔ وہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ سماجی اقدار کا کوئی خاص شعور ہمارے شاعروں کے اندر موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی نجی الجھنوں اور پریشانیوں میں کھوئے رہتے تھے۔ زندگی ان کے سامنے اجتماعیت کے روپ میں آئی ہی نہیں تھی۔ شاہت کا زمانہ تھا۔ جاگیرداری فروغ پر تھی۔ عوام کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اسلئے ہر شخص اپنی انفرادیت کا پرستار تھا۔ سماج کے ہر فرد نے اپنے آپ کو اسی انفرادیت کے دائرے میں اسیر کر لیا تھا۔ ان کی دنیا ہی انفرادیت تھی۔ اور اسی انفرادیت کی دنیا میں سانس لینے کی وجہ سے داخلیت کا ان پر خاصا اثر تھا۔ وہ اپنی باتیں کرتے تھے۔ خارجی حالات پر بہت کم نظر ڈالتے تھے۔ سلطنتوں کی عمارتیں گر رہی تھیں۔ تہذیبوں کے جنازے نکل رہے تھے۔ ساری سماجی زندگی ایک مستقل اور مسلسل کرب کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ افراد پریشان حال تھے۔ لیکن ان خارجی حالات کو ہمارے شاعروں نے بہت کم دیکھا ہے۔ اس کے اثرات ان پر ضرور پڑے ہیں۔ اُنھوں نے اس کی ترجمانی بھی کی ہے۔ لیکن ترجمانی صرف اس حد تک ہے۔ جس حد تک ان کی ذات اور انفرادیت ان حالات سے متاثر ہوئی ہے۔ اُنھوں نے ذاتی اور انفرادی الجھنوں اور پریشانیوں کا بیان کر دیا ہے۔ اپنی زبوں حالیوں کی تصویریں کھینچ دی ہیں —— اپنے نجی حالات کے نقشے بنا دیئے ہیں —— اور اس میں بھی خارجیت بہت کم ہے۔ انفرادی اور شخصی حالات کی ترجمانی میں بھی داخلی رنگ گہرا نظر آتا ہے۔

یہ صورتِ حال بھی ان حالات ہی کا نتیجہ ہے۔ جس میں ہمارے قدیم کلاسیکی ادب نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی۔ ایک تو اس زمانے میں، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، زندگی کے اندر اجتماعیت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ سماجی زندگی ایک مخصوص طبقے کی سماجی زندگی تک محدود تھی —— یہ طبقہ جاگیرداروں کا طبقہ تھا۔ خود غرضی اور انفرادیت پرستی اس جاگیردار طبقے کے افراد کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جو صرف اپنا مفاد چاہتے تھے۔ ان کا ہر اقدام صرف اپنے لئے ہوتا تھا۔ اور اس طرح یہ روش چل نکلی تھی، اور زندگی کو اس زاویہ نظر سے دیکھنے کا رواج ہر طبقے کے ہر فرد میں عام ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ زمانہ بڑے ہی انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا ہر طرف پریشانیوں اور مصیبتوں کے بھوت اپنے جبڑے کھولے ہوئے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے درپے تھے۔ اسلئے ہر شخص کو اپنی فکر تھی۔ وہ اپنی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اسکے اپنے نجی اور شخصی مسائل اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ گھٹے ہوئے ماحول نے اُسے داخلیت پرست بھی بنا دیا تھا۔ ایسے خارجیت اور اجتماعیت کے الگ اس کے یہاں کس طرح پیدا ہو سکتے تھے؟

بے شک اس سے ہمارا قدیم کلاسیکی ادب بڑی حد تک محروم ہے، لیکن اس کے باوجود ماحول کا عکس داخلی انداز ہی میں سہی، نظر ضرور آ جاتا ہے۔ غزلیات تک میں کہیں کہیں اسکے اثرات ملتے ہیں۔ فنی خصوصیات کی تشکیل و تعمیر تک میں اُن کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ کے جو قنوطیت اور حزن و ملال ہے۔ اور سوداؔ کے یہاں جو زہر قند ہے۔ وہ اسی ماحول کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس میں اُنھوں نے سانس لی تھی۔ اور آپس کا یہ فرق افتادِ طبع کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ان کے فنون میں ایک میٹھے میٹھے درد کی سی کیفیت، حالات ہی کی پیدا کردہ ہے۔ میرؔ کو تو اپنا دل بھی ایک نگر کی طرح سو سو مرتبہ لٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ

اس کی آنکھوں نے دلی کو لٹتے ہوئے دیکھا تھا۔

دلی کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس تشبیہ سے یہ صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ فنی خصوصیات تک میں ماحول کے اثرات ملتے ہیں۔ اور ایک میر ہی پر منحصر نہیں۔ اس زمانے کے عام شاعروں کی تخلیقات میں اس خصوصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔

—— خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ہمارے قدیم کلاسکی ادب میں سماجی حالات کی ترجمانی موجود ہے۔ ہر چند وہ داخلی انداز ہی میں سہی۔ ہر چند وہ انفرادی نقطۂ نظر ہی سے سہی! لیکن بہر حال اس کا وجود ہے —— غزلوں تک میں، جو بظاہر حسن و عشق یا زیادہ سے زیادہ تصوف و فلسفہ کے موضوعات کے لئے مخصوص ہیں، سماجی حالات کی ترجمانی انفرادی نقطۂ نظر سے داخلی انداز میں ملتی ہے۔

نگر ہوا آباد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا — یہ زر دشمن اس رئیس سے تنک جو لٹتے دیکھے یار اپنا

تڑپ کے خرمن گل پہ کبھی گرائے بجلی — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا (سودا)

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم — اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا (میر)

اب شہر ہر طرف سے میداں ہو گیا ہے — پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا (میر)

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے — دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے (میر)

میر داخلی انداز میں اس تباہی کی ترجمانی میں سب سے پیش پیش ہے، جو اس کے ماحول پر مسلط تھی۔ چنانچہ کہیں کہیں تو وہ صاف کہتا ہے ؎

اب خرابا ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلی میں اب کے آکر ان یاروں کو نہ دیکھا — کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں — تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزر — کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

خاک دہلی سے کیا ہم کو جدا یک بارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا

ہفت اقلیم ہر گلی ہے —کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا — ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا

دلی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر — ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

ان اشعار سے دلی کی تباہی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اور دلی ہی میر اور ان کے ہمعصروں کا ماحول تھا۔ دلی ہی پر ان کی سماجی زندگی منحصر تھی کہ وہ اپنی تہذیب سمجھتے تھے۔ وہی ان کی دنیا تھی۔ وہ اس سے باہر نکل کر دیکھتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ دلی کی ترجمانی حقیقتاً اس زمانے کی سماجی زندگی کی ترجمانی تھی —— اور یہ خصوصیت کم و بیش ہر زمانے کے شاعر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتی ہے — ایک میر ہی پر منحصر نہیں —!

دلی کی تباہی کے ادب میں سماجی حالات کی یہ ترجمانی کہیں شہر آشوب وغیرہ کی صورت میں خارجی رنگ کے ساتھ بھی اپنے آپ کو نمایاں کر کے پیش کرتی ہے۔ میر نے بھی شہر آشوب لکھے ہیں اور سودا نے بھی، لیکن ایک مخصوص افتاد طبع رکھنے کے باعث سودا میں خارجیت کو پیش کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی چنانچہ سودا کا شہر آشوب اس زمانے کی سوسائٹی کے انحطاط و زوال کی ہو بہو تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں معاشی بدحالی کا ذکر بھی ہے۔ نوکری نہ ملنے کا بیان

بھی — امیروں کی زبوں حالی کے نقشے بھی ہیں — فاقہ کا تذکرہ بھی — ہنگاموں اور افراتفری کی مصوری بھی ہے اور انتشار و تاراج کی فوٹو گرافی بھی! اسے

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز　　تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز　　کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغِ غول

کسی کے ہاں نہ رہا آسیا سے تابہ اجلاع　　ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ　　اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر سنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس　　کہ جنکے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس　　بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم　　نہ جانے کس نے دکھایا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اُگے ہے زقوم　　مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

رکھیں تھے سیر کو پنگھٹ کے گرد کے دیہات　　کہ لب جہاں کے تھے پنہاریوں کے آبحیات
اور ان درختوں کی سے چھائیں میں کٹتے سو بات　　نہ وے درخت ہیں اب یاں نہ آدمی کی ذات
کوئیں میں مردے پڑے ہیں نہ رسیاں ہے نہ ڈول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا جیسے کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی واں نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس　　پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کروڑ دل تھے پر امید ہو گئے مایوس　　گھروں سے یوں بجا کے نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں جو تھے صاحب چنڈول

عجیب نادیوں کا ان لوگوں ہے یہ معمول　　وہ برقع سر پہ ہے جس کا کمر تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول　　اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک ہے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر　　کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو ملے بگردش دہر　　تو بیٹھ کر کہیں یہ سوچئے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں　　وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے وہ کباب نہیں

کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پُرآب نہیں ۔۔۔ سما سکے تری بات کا جواب نہیں

کہ یہ فنا ہے اک طرح کا زیادہ نزول

سودا کے شہر آشوب کے یہ بند مغلوں کے آخر عہد کی پوری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ جب مغلوں کا آفتاب گہنا رہا تھا اور ساری زندگی، ساری تہذیب، اور سارے سماج پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ پرانی عظمتوں کی نشانیاں مٹی جا رہی تھیں۔ اور اس کے نتیجے میں فتنوں نے ایسا سر اٹھا رہا تھا۔ کہ زندگی کے ہر شعبے میں بھونچال آ گئے تھے۔ زندگی کی تمام اقدار میں انحطاط و زوال کا بسیرا تھا۔ سودا نے ان تمام حالات پر جس خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ——

سودا سماجی زندگی کا محض ایک عکاس اور ترجمان ہی نہیں تھا۔ بلکہ حالات کے گہرے تاثر نے اس کی باتوں میں ایسے نشتر کھول دیئے تھے کہ جن کی مثال اردو ادب میں کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ سودا اپنے زمانے کی زبوں حالیوں، انتشار، اور افراتفری سے جب تنگ آتا ہے۔ تو اپنے ماحول کی ہر چیز پر طنز کے نشتروں سے کچوکے لگانے لگتا ہے۔ اس کی ساری سماجی ہجویات میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر صرف "گھوڑے" کی ہجو دیکھیے۔ اس گھوڑے کے بیان میں انحطاط کی ساری روح کو سودا نے بے نقاب کر دیا ہے۔ موضوع یہ ہے کہ ایک صاحب کے پاس گھوڑا ہے۔ وہ صاحب اس گھوڑے کا حال بیان کرتے ہیں کہ جس وقت مرہٹوں نے دلی پر حملہ کیا۔ تو اس کی کیا حالت ہوئی ؎

دلی تک آن پہونچا تھا جس دن کہ مرہٹہ ۔۔۔ مجھ سے کہا نقیب نے آ کہ ہے وقت کار

مدت سے کوڑیوں کو اٹھا لے ہے گھر میں بیٹھ ۔۔۔ ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین ۔۔۔ ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے گھڑ سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں ۔۔۔ دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا نہ باگ ۔۔۔ ٹک ٹک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سئیس ۔۔۔ پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ ۔۔۔ ہٹتا نہ تھا زمیں سے مانند کوہسار

اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام ۔۔۔ اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیئے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں ۔۔۔ یا بادبان باندھو پیں کے وہ اختیار

غور کرنے کی بات ہے۔ مرہٹوں کے مقابلے میں ایک سپاہی ایسے گھوڑے پر لڑنے کے لئے جاتا ہے۔ لڑائی کا نتیجہ معلوم ہے۔ یہ صرف گھوڑے ہی کی ہجو نہیں ہے —— اس زمانے کے مغلوں کی فوج کی جو حالت ہو گئی تھی، سودا نے اس پر طنز کے وار کئے ہیں۔ سودا کے وار کتنے کامیاب ہیں —— اس پر تو وہ قہقہہ ہی دلالت کرتا ہے، جس کو ضبط کرنا اس اقتباس کے پڑھنے کے بعد مشکل ہے —— کیا یہ سماجی زندگی کی ترجمانی نہیں؟ —— کیا اس طنز میں افادیت کی بجلیاں کوندتی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں؟ —— سب کچھ اس میں —— اور اسی طرح کی دوسری تخلیقات میں موجود ہے، لیکن بڑی مشکل یہ ہے، کہ ابھی تک کسی نے ان حقیقتوں کے چہرے سے نقاب نہیں اٹھائی۔ ابھی تک لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اردو کا سرمایہ صرف غزل ہے اور غزل میں بھی سمٹی ہوئی حسن و عشق کی لایعنی داستانیں! —— غزل اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ ہے، اور اس میں اعلیٰ اور آفاقی خیالات موجود ہیں۔ لیکن غزل کے علاوہ اردو شاعری میں دوسری اصناف بھی ہیں۔ مثنوی ہے، قطعہ ہے، مسدس ہے، مخمس ہے، مثلث ہے، اور ان سب کی ہیئت کے اعتبار سے اس میں موضوعات بھی سموئے گئے ہیں۔ لیکن بڑا افسوس اس بات کا ہے۔ ان کی طرف آج تک توجہ نہیں کی گئی۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اردو کے قدیم کلاسیکی ادب میں سماجی زندگی کی ترجمانی موجود ہے۔ اس میں عام طور پر داخلیت کا پلہ بھاری

ہے۔ لیکن خارجیت کا بھی فقدان نہیں۔ جو شاعر غزل سے ہٹ کر دوسری اصناف سخن میں اس موضوع پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خارجیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ——————— البتہ اجتماعی شعور کے ماتحت ان خیالات کا اظہار بہت کم نظر آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اجتماعیت کا کوئی تصور اس زمانے میں ہماری زندگی کے اندر پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اجتماعیت کا تصور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوتا ہے جب ایک نئی زندگی کی طرح ڈالی جاتی ہے شاہت کے زمانے میں، جب عوام کو نہ ہونے کے برابر سمجھا جائے۔ اور سمجھنے نہ سمجھنے کا انحصار بھی جب ایک مخصوص طبقے کے مخصوص افراد پر ہو تو بچارے عوام کا کون خیال کرتا ہے اور اجتماعیت کس شمار میں آتی ہے۔ ناممکن ہے جو اس طرف توجہ کی جائے۔ چنانچہ قدیم ادب میں اجتماعی شعور نام کو بھی نہیں۔ لیکن عوام کے بنیادی مسائل کی دبی ہوئی چنگاریاں کہیں کہیں ٹٹولنے سے نظر ضرور آجاتی ہیں —— مثلاً امیری اور غریبی، افلاس اور بد حالی کا ذکر کہیں کہیں ضرور آجاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ان موضوعات میں کوئی سائنٹیفک نقطۂ نظر اس زمانے کے لکھنے والے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اور نہ اُن سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف یہ کہہ سکتے تھے ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے　　　ولیؔ

باعثِ رسوائی عالم ولیؔ　　　مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی　　　ولیؔ

منعم کے پاس قاقم وسنجاب تھا تو کیا　　　اس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا　　　میرؔ

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا　　　پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا　　　میرؔ

اے حشر جلد کر تہ و بالا زمین کو　　　یوں کچھ نہیں اُمید تو ہے انقلاب میں　　　مومنؔ

اور اس قسم کے خیالات کا اظہار بھی بہت کم شاعروں نے کیا ہے۔ جب قناعت کو زندگی کی معراج اور دنیا چھوڑ دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے، ایسے ماحول میں بنیادی خیالات کی طرف کیسے توجہ کی جا سکتی تھی۔ ان اجتماعی موضوعات کا نہ عوام میں کوئی شعور تھا نہ خواص میں! کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھے۔

البتہ بعض ایسے شاعروں کے یہاں یہ اجتماعی شعور بھی نظر آجاتا ہے، جو طبقۂ خواص سے ہٹ کر عوام کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جنہوں نے اپنی تخلیقات کو عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ایسے قدیم شاعروں میں صرف ایک نظیرؔ اکبر آبادی ہمیں ملتا ہے۔ جس کی شاعری تمام تر عوامی جذبات و احساسات کی حامل ہے۔ اور ساتھ ہی اجتماعی شعور بھی اسکے یہاں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ یہ دیکھ کر اور بھی حسرت ہوتی ہے۔ کہ نظیرؔ نے ان خیالات اور جذبات و احساسات کو اس زمانے میں پیش کیا ہے۔ جب بعضوں کے خیال میں یہ موضوعات شاعری کے دائرے سے خارج تھے۔ چنانچہ نظیرؔ کو اسکے زمانے میں اور اسکے برسوں بعد تک شاعر ہی نہیں مانا گیا۔ شیفتہ تک نے گلشن بیخار میں یہ لکھ دیا کہ نظیرؔ کی شاعری کو شاعری کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ نظیرؔ اپنے خیالات و نظریات کے اعتبار سے، زندگی کے بارے میں اپنے زاویۂ نظر کے اعتبار سے، شاعری میں موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی کے اعتبار سے ایک بڑا شاعر ہے، زندگی کا کونسا موضوع ہے۔ جس پر اس نے عوام کے نقطۂ نظر سے روشنی نہیں ڈالی ہے —— (۱) ایسے موضوعات پر جن کی نوعیت مادی ہے، ان کو تو اس نے خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے

وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں　　　(۲) روٹیوں کی تعریف

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے　　　سب رنگ دم میں کر دے مصور کے کر کرے

صورت بھی اس کی دیکھ کے منہ کھنچ کے سپرے　　　تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ بھرے

اُسکے تو منہ کا رنگ اُڑاتی ہے مفلسی (مفلسی)

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں — منشی وپیر و وزیر و منشی و نواب و خاں
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی راتیاں — کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہئے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا (آٹے دال کا بیان)

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں — ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اُپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں — ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں (برسات کی بہاریں)

غرض یہ کہ نظیر نے ہر جگہ عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ایسے عوامی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ جن سے عوام کی زندگی عبارت ہے۔ ان کی خوشیاں، ان کے رنج وغم، ان کے جذبات، ان پر بیتی ہوئی کیفیات، ان کے تہوار، ان کی آٹے دن کی دلچسپیاں، ان کے خیالات و نظریات، اعتقادات و توہمات سب کے سب نظیر کی شاعری میں بے نقاب ملتے ہیں — نظیر اس اعتبار سے بہت بڑا شاعر ہے۔

نظیر کی اجتماعیت کے علاوہ بعض ایسے غزل گو شاعروں کے یہاں اپنے زمانے کی سماجی اور مذہبی تحریکوں تک سے دلچسپی ملتی ہے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی عشقیہ شاعری کرتے ہوئے گزار دی ہے۔ مثال کے طور پر مومن ہی کو دیکھئے۔ مومن خالص حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ لیکن اسکے باوجود مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک سے اُنہوں نے دلچسپی لی ہے اور جہاد کے موضوع پر اُنہوں نے مثنوی لکھی ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں ؎

زہے سید احمد قبول خدا — سرِ امتانِ رسولِ خدا
ہمو گوہری کا نہ پوچھو شرف — علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف!
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفار کی موت اس کی حیات

اور پھر یہ تمنا بھی کی ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں اُمید وار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے! — عروج شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھ — ملا دے امام زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

حالانکہ مومن کو اس نقطۂ نظر سے کوئی نہیں دیکھتا۔ اس کو صرف حسن و عشق کی دنیا کا ایک مغنی سمجھا جاتا ہے اور بس! اس کے اسی طرح کے شعر پڑھ کر لوگ جھومتے ہیں۔ لیکن اس بات کا انہیں خیال نہیں ہوتا کہ وہ حسن و عشق کے ترجمان کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

یہ ٹھیک ہے اس سماجی اور خصوصاً اجتماعی شعور کی مثالیں اردو قدیم کلاسیکی ادب میں کم ملتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت تو اور بھی اسے ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد اپنی اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ خود زندگی میں اجتماعیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ جب شاعری کو عوام سے علیحدہ رکھنے پر زور دیا جاتا تھا۔ جب ادب و شعر کے موضوعات محدود تھے، تو پھر اجتماعیت کا شعور اس میں کیسے آتا — آخری ادب میں اسی چیز

کا عکس تو نظر آتا ہے، جو خود زندگی میں ہوتی ہے۔

ادب و شعر کے بارے میں آجکل اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ صرف جذبات و احساسات ہی کی ترجمانی ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں شعور و ادراک، عقل و خرد اور سوچ بچار کو بھی دخل ہونا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ اُردو کا قدیم کلاسیکی ادب صرف ہلکے پھلکے جذبات و احساسات کی ترجمانی کیلئے وقف رہا ہے، اس میں ٹھوس موضوعات کی ترجمانی کہاں سے آئی۔ لیکن ایسا نہیں ہے — اردو کے قدیم کلاسیکی ادب میں ٹھوس اور گہرے خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ غزل کی صنفِ سخن تک میں ان خیالات کو پیش کیا گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ تصوف نے اس سلسلے میں بڑی ہی مدد کی ہے فلسفیانہ رجحان اُردو کے قدیم ادب میں تصوف ہی کے سہارے سے آیا ہے۔ تصوف کے زیرِ سایہ جو خیالات پرورش پائیں گے، ظاہر ہے، ان میں زندگی سے بیزاری۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس، موت کا خیال، —— غرض یہ کہ اسی طرح کے موضوعات کا پایا جانا یقینی ہے۔ اردو ادب میں ان موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اور متقدمین ہی نے ان موضوعات میں خاصی گہرائی سے کام لیا ہے۔ لیکن غالب تک آتے آتے موضوعات فکر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور غالب ان موضوعات سے آگے نکل کر زندگی کے دوسرے موضوعات پر بھی فلسفیانہ زاویۂ نظر سے روشنی ڈالتا ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا — میر

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا — ولی

واے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا — درد

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کے اس کارگہ شیشہ گری کا — میر

اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم — اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا — میر

آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بیخوداں — جاگا وہی ادھر سے جو مونڈ آنکھ سو گیا — درد

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں اک شکل — گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل — درد

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں — غالب

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں — غالب

مٹتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کہیں — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو — غالب

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا — غالب

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں — غالب

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے — غالب

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس فلسفیانہ رجحان سے متعلق تو اردو کی قدیم شاعری میں ہر شاعر کے یہاں بے شمار شعر مل جائیں گے۔ بعضوں نے روائتی انداز میں دوسروں کی دیکھا دیکھی بعض خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن بعضوں نے واقعی مختلف موضوعات کے بارے میں گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ایسے اشعار لکھنے والوں کی وقتِ نظر کا فوراً احساس ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان شاعروں کے فلسفیانہ خیالات میں کوئی تسلسل نہیں ہے۔ وہ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن بہرحال وہ اُن کی فکر کی بلندی اور نظر کی گہرائی پر دلالت کرتے ہیں ——

قدیم کلاسیکی ادب ان موضوعات کے علاوہ مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت سے بھی محروم نہیں ہے۔ مثنویوں اور مراثی میں اس کے بہت سے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے تو مختلف مناظرِ قدرت اور زندگی کے مختلف مظاہر پر باقاعدہ نظمیں لکھی ہیں۔ ابن نشاطی، غواصی، نصرتی

کی مثنویوں میں بھی ان موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ ادھر شمالی ہندوستان میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان اس اعتبار سے بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم بھی اس اعتبار سے خاصی بلند مرتبہ ہے۔ انیس و دبیر کے مراثی میں تو مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن کو کسی ملک کے بھی ادبیات کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اور پھر غزلیات میں بہار، خزاں، برسات، اور اسی طرح کی اور باتوں کا بھی ذکر کہیں کہیں نظر آتا ہے — غزل کے شاعر ان موضوعات کو خارجی زاویہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ برخلاف اس کے داخلی انداز میں ان موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اپنے اصل موضوع کے لئے ان کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں ——— ان کے علاوہ جنگوں کے نقشے، اور محفلوں کی تصویریں، بھی اس میں نظر آتی ہیں، غرض یہ کہ اس میں موضوعات کے اعتبار سے بڑا تنوع ہے۔ اور اسی میں اس کی بڑائی کا راز پوشیدہ ہے۔

ادب قدیم سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بدگمانی اچھی سے اچھی اور بلند سے بلند چیز کی حیثیت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اور یک قلم اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ قدیم کلاسیکی ادب میں بہت کچھ —— بلکہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن اس کو دیکھنے کیلئے ایک چشم بینا کی ضرورت ہے۔ اس کو "چشم تنگ" بنا لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ صرف "کثرت نظارہ" سے وا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قدیم کلاسیکی ادب میں بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن یہ خامیاں اس کی اچھائیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتیں۔ جہاں تک خامیوں کا تعلق ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ادب ہو جو خامیوں سے یکسر پاک ہو ہمارے قدیم ادب میں جو خامیاں ہیں، وہ کچھ تو واقعی صحیح معنوں میں خامیاں ہیں۔ لیکن کچھ خود ہمارے ذہنوں کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور جس کا سرچشمہ وہی بدگمانی ہے جو قدیم ادب کو سمجھنے کے سلسلے میں ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ قدیم ادب میں جو خامیاں ہیں۔ وہ بھی اس حقیقت سے ہم آہنگ ہونے کی دلیل ہیں کیونکہ یہ خامیاں بعض مخصوص خارجی حالات میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ وہ خود اپنے ماحول کی شکوہ سنج ہیں۔ اس لئے ان سے ہماری شکوہ سنجی کچھ زیب نہیں دیتی۔ قدیم کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرتے وقت یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے چند حدود ہیں۔ جن سے باہر نکال کر اگر اُسے دیکھا جائے گا۔ تو اس میں کوئی بھی خوبی نظر نہ آئے گی اور وہ صرف خامیوں اور برائیوں کی ایک پوٹ معلوم ہوگا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا قدیم کلاسیکی ادب ہماری زندگی کی صحیح اور سچی تاریخ ہے۔ اس میں ہماری تاریخ کے تین سو سال کے سارے مدوجزر اور تمام نشیب و فراز کی کہانیاں موجود ہیں۔ اور اس میں قدم قدم پر ہمیں زندگی کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے افکار و خیالات، عقائد و نظریات افتاد طبع اور ذہنی رجحانات کی تصویریں ملتی ہیں ——— وہ ان سب کا آئینہ دار ہے۔

یہ اجمال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔

یہ تو یہ حقیقت کہ ہمارا قدیم کلاسیکی ادب تاریخ کا صحیح آئینہ دار اور سماجی، معاشی اور ذہنی و فکری زندگی کا سچا اور پر خلوص ترجمان ہے۔ اور ہمارے پرانے لکھنے والوں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور فضاء ماحول سے پوری طرح اثرات قبول کئے ہیں۔ اور ان کا اظہار کیا ہے۔ چاہے یہ اظہار داخلی انداز میں ہوا ہو یا خارجی طریقے پر۔ چاہے اس میں عقل و شعور ان کے شمع راہ بنے ہوں، چاہے صرف جذبات کی لہروں کو انہوں نے فن کا روپ دیدیا ہو، لیکن بہرحال ایسا ہوا ضرور ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تاریخ اور حالات و واقعات کے تجزیاتی مطالعے کی ضرورت ہے۔

اردو ادب نے جس وقت آنکھ کھولی ہے، وہ وقت ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کا بڑا ہی کٹھن زمانہ تھا۔ ملک میں نراجی حالت کی حکمرانی تھی۔ حالات ناساز گار تھے۔ چاروں طرف افراتفری کا دور دورہ تھا۔ مغلوں کی سلطنت کے چراغ کی لو جھلملانے لگی تھی —— اور وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی اب گل ہوا چاہتا تھا۔ ان حالات نے سماج کے افراد کی زندگیوں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں —— ہر شخص اپنی جان و مال کو بچانے کے لئے، عزت و حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے پریشان و سرگرداں تھا۔ اس کیفیت نے نہ صرف مادی اعتبار سے سماج کے افراد کو زبوں حالی کا شکار بنا دیا تھا۔ بلکہ ذہنی فکری اعتبار سے بھی وہ سب کے سب ایک کرب میں مبتلا نظر آتے تھے —— ان حالات کو سدھارنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ اونچے طبقہ کی

سیاست نے اُنہیں اس قابل ہی نہیں رکھا تھا۔ کہ وہ اس کے بارے میں سوچ بھی سکیں — اور اُنہیں اُس کا خیال بھی آسکے۔ ایسی صورت میں صرف ایک راستہ ان کے سامنے رہ جاتا تھا۔ وہ یہ کہ یہ لوگ اپنے دلوں پر جبر کرکے حالات کے مدوجزر کو صرف دیکھا کریں۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کریں۔ کہ ان حالات کے نتیجے میں جو موج حوادث ان کی ذات اور شخصیت کے سر سے گزر رہی تھی۔ اس کے متعلق کچھ رنج و غم کا اظہار کر دیں — آنسو بہا دیں، اور اگر حد سے آگے بڑھیں تو خود اپنے گریبانوں کو پھاڑ کر خودکشی کر لیں۔ اور مر جائیں — "دیوانگی" اور "جنون" کا راستہ اس وقت تک تعمیر ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے لئے ویرانہ کہاں سے آتا — اور دشتوں کی ہنگامہ آرائیاں کس طرح باقی رہ جاتیں — یہ سب کچھ ناممکن تھا — کیونکہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے — فکر کی جولانگاہ محدود تھی۔ عمل کے لئے میدان ہی نہیں تھا —

ان حالات کے سائے میں صرف انفعالیت، زندگی سے بیزاری، ماحول سے جھنجلاہٹ، قنوطیت اور حزن و یاس ہی کے پودے پنپ سکتے تھے۔ فرار اور سماج سے علیحدگی ہی پروان چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ یہی ہوا ہے۔ سارے قدیم کلاسیکی ادب میں انہیں حالات کی ترجمانی ہے۔ انہیں ذہنی کیفیات کی عکاسی ہے۔ وہ اپنے زمانے کی زندگی کے سارے مدوجزر کا ترجمان ضرور ہے، لیکن اس خصوصیت نے اس میں ایک سماجی زندگی اور حالات کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کو پیدا کیا ہے — اس ادب میں کوئی مادی پیغام نظر نہیں آئے گا۔ اس میں عمل کی طرف بلاوے کا سندیس نہیں مل سکتا۔ لکھنے والوں کے تاثرات، ذہنی کیفیات، اور سوچ بچار کی تصویریں مل سکتی ہیں — اور حالات کی صحیح، سچی اور پُرخلوص ترجمانی نظر آسکتی ہے — اور بس! کہیں کہیں اس میں فراری کیفیت کے اثرات بھی نظر آجاتے ہیں۔ کیونکہ ناسازگار حالات کو بدلنے کیلئے جب فکر و خیال تک پر بندشیں ہوں۔ تو پھر اس کیفیت کا پیدا ہونا یقینی ہے — انسان کے لئے آسودگی کا کوئی راستہ تو ہونا چاہیئے۔

پھر اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس زمانے کے زیادہ لکھنے والے خود بھی اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور عوام کا ان کی نظروں میں بھی کوئی حیثیت نہیں تھی — کیونکہ عوام کا کوئی تصور ہی اس وقت موجود نہیں تھا شہنشاہیت اور جاگیرداری کے راج نے عوام کی کوئی حیثیت باقی نہیں رکھی تھی۔ ہماری تاریخ انسانوں کی نہیں، عوام کی نہیں، سماجی زندگی کی نہیں، بادشاہوں اور جاگیرداروں کی تاریخ تھی — اس لئے اُنہوں نے اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے طبقے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن کیا ان حقائق سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ کیا وہ نظرانداز کئے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں — وہ ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہیں — ان کو علیحدہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جسم کے مختلف اعضا کو کاٹ کر علیحدہ کر دینے کی کس میں سکت ہے؟ بدگوشت ہو تو کاٹا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بدگوشت نہیں۔ جسم کا ایک پورا حصہ ہے — نہیں نہیں بلکہ جسم ہے — اس کو کاٹنے کے لئے سرے سے جسم ہی کو ختم کرنا ہوگا — اور یہ ممکن نہیں! —

یہ تو خیر افکار و خیالات کی باتیں تھیں — فنی خصوصیات کی تعمیر و تشکیل تک انہیں حالات کے زیر اثر ہوئی ہے۔ مخصوص سانچے بنائے گئے ہیں مخصوص انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ مخصوص طرز ادا کی بنیادیں ڈالی گئی ہیں۔ مخصوص اصناف سخن کی تشکیل ہوئی ہے۔ جو اُس مخصوص فضا کے زیر اثر پرورش پائی ہوئی خصوصیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں — فن و ادب کے بارے میں جن نظریات کو قائم کیا گیا ہے، ان میں بھی یہی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء تک یہ صورت حال باقی رہتی ہے۔ کیونکہ اُس انقلاب سے پہلے اگرچہ بیسیوں انقلابات آئے۔ لیکن صحیح معنوں میں ان میں سے ایک کو بھی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے قبل انقلابات صرف سلطنتیں بدلنے کے لئے آتے تھے۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کی تبدیلی کے لئے آتے تھے، لیکن عوام کی قسمتوں میں ان سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تھی۔ ایک بادشاہ کی جگہ دوسرا بادشاہ تخت نشین ہو جاتا تھا۔ ایک سلطنت کی جگہ دوسری سلطنت وجود میں آجاتی تھی۔ عوام کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ جہاں وہ ہمیشہ سے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہماری زندگی دنیا بدل دی۔ پرانی شاہت ختم ہو گئی۔ ایک نئی شاہت آئی۔ اس طرح تو کوئی بڑا فرق نہیں ہوا، لیکن سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ نقطۂ نظر میں انقلاب

آگیا۔ سوچنے کے طریقے بدل گئے — نیا ماحول نئے افکار و خیالات کا متقاضی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں کہیں جاکر ہمارے ادب میں انفعالیت کی جگہ عملیت اور مادیت لے لیتی ہے — اس انقلاب کے بعد کا بھی ایک خاص حصہ ہمارے کلاسیکی ادب میں شامل ہے۔ اور بعض لوگ تو اسے قدیم ہی سمجھتے ہیں۔

اس تجزیئے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہمارا قدیم کلاسیکی ادب ہماری سیاسی، سماجی، معاشی، ذہنی اور فکری تاریخ کا یہ آئینہ دار، ترجمان اور عکاس ہے — ہر چند یہ آئینہ داری، ترجمانی اور عکاسی، ایک مخصوص زاویہ نظر ہی سے سہی! لیکن بہر حال اسی وجہ سے وہ زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے — اور زندہ رہے گا۔ ساتھ ہی اسکے زندہ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ اس نے اس ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کے بنیادی، آفاقی اور کائناتی موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اور جن کو زمان و مکان کی بندشوں میں گرفتار بلا نہیں کیا جا سکتا۔ جن پہ وقت اور ماحول کی قید نہیں لگائی جا سکتی — جو تاریخی اور جغرافیائی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادب کو پڑھنا چاہیئے۔ اس کا پڑھنا ناگزیر ہے اس سے فرار کبھی اختیار نہیں کیا جا سکتی — یہ ماننا کہ "نئے جنوں" کو "نئے ویرانوں" کی ضرورت ہے، لیکن پرانے کو وہ صحرا ہیں جو کیفیتاً باقی ہے — اور جو حقیقتاً باقی ہے — جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں — اس سے چشم پوشی کرنا "نئے جنون" کے لئے پیدا کئے جانے والے نئے ویرانوں کو فنا کی نیند سلا دینے کے برابر ہے۔

قمر اجنالوی

مشرق

(اینگلو امریکن بلاک کے نام)

ابتدائیہ

اِک طرف رونقِ انجمن کیلئے تم ستاروں کی شمعیں جلاتے رہے
اک طرف طاقِ انسانیت پر مگر آنسوؤں کے دیئے جھلملاتے رہے
آگ اور خون کے گرم بازار میں۔
زندگی موت کے بھاؤ بکتی رہی،
مغربی شہسواروں کا ہر قافلہ،
ایشیا کی زمیں اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرتا رہا،
اور اس فتح و نصرت کی یلغار میں
جسم چھیدے گئے۔ سر اتارے گئے۔
رات کی ظلمتیں "سرخرو" ہو گئیں اس قیامت کے شبخون مارے گئے
زخم خوردہ سپاہی مرے دیس کے
خون آلود میتوں کے بستر پہ جاں آزما ہو گئے۔
سانس لیتے ہوئے موت کی گود میں سو گئے۔
سرد ہونٹوں پہ فریاد کی لے اٹھی
زندگی گرم اشکوں میں ڈھلتی رہی
ایک مجبور انسانیت سرزمینِ عجم میں تڑپتی سسکتی رہی
اور تم امن کے دیوتا اپنی مسند پہ بیٹھے ہوئے۔
امن اور صلح کے گیت گاتے رہے
اپنے خوابوں کی دنیا بساتے رہے۔

مجھ سے پنہاں نہیں میرے مشرق کی وہ داستانِ الم
جس کو میرے ہی آبا و اجداد کے خون نے لکھا گیا۔
جس کو لکھتے ہوئے سینکڑوں ہاتھ تم نے قلم کر دیئے۔
اور اگر آج بھی تم میں مردانگی ہے تو آؤ مرے ہاتھ بھی کاٹ لو
کیونکہ میں ایشیائی ہوں —
اور ایشیا کے بہادر شہیدوں کی تقلید میں۔
آج لکھتا ہوں میں بھی وہی داستاں
جس کے مضمون کی سرخی کی خاطر مرے دیس میں تم تباہی مچاتے رہے
—— خوں بہاتے رہے

پہلا دور

مجھ سے پنہاں نہیں میرے مشرق کے انوار کی داستاں
جس کے رنگیں افق سے برستی رہیں ہر زمانے میں حکمت کی تابانیاں
جس کے فرزند ہر دورِ وحشت میں امن و محبت کے اپدیش دیتے رہے

جس کی دانشوری کے چراغوں سے انسان عرفان کا نور لیتے رہے
جس کے بیٹے فنونِ لطیفہ کے خلّاق مانے گئے ۔
جس کے فن شہرہ آفاق مانے گئے
ہر زمانے میں نبضِ جنوں جس کی چلتی رہی
اک نئی زندگی جس کے ہر بحر و بر میں مچلتی رہی
جس کے میدان چاندی لٹاتے رہے
جس کے کہسار سونا اگلتے رہے
جس کے دریا جواہر اچھالا کئے
جس کے کھیتوں سے موتی نکلتے رہے
تم جزیروں کے چالاک چوروں نے ــــــــ
ــــــــ اس سرزمیں کو یتیموں کی دولت سمجھ کر اسے لوٹنے
ــــــــ کے ارادے کئے

مغربی ظلمتوں میں ہوئی سازشیں
اور مشرق کی زرتاب کرنوں پہ سوداگری کے سیہ جال پھینکے گئے
منڈیوں میں نئے مال پھینکے گئے ۔
ارضِ مشرق کے بازار میں اجنبی رونقیں بڑھ گئیں ۔
ایشیائی خریدار تھے مال کی قیمتیں چڑھ گئیں ۔
اور ہر مال کے ساتھ اک اجنبی فوج آنے لگی
اک قیامت امنڈتی ہوئی موج در موج آنے لگی
ایشیا کے خزانے بکھرنے لگے
میرے خرمن کے دانے بکھرنے لگے
اور صدیوں کی تقدیس کے تانے بانے بکھرنے لگے
تاجرو! میرے مشرق کے بازار میں تم ہمیشہ نئی جنس لاتے رہے

اک نئی لوٹ ہر دم مچاتے رہے ۔

ایشیائی ممالک میں تہذیبِ نو کی پُراسرار سوغات لائی گئی
میرے مشرق کے تابندہ گردوں پہ دھوکے سے اک اجنبی رات لائی گئی
اور اس رات کی ظلمتوں میں یہاں دامِ ہم رنگِ ظلمت بچھاتے گئے
کچھ تجارت کے جلوے دکھاتے گئے ۔
کچھ سیاست کے گُر آزماتے گئے
میرے مشرق کی تقدیر میں کچھ نئے پیچ ڈالے گئے ۔
اور بھائی سے بھائی لڑاتے گئے ۔
پھر تجارت حکومت میں بدلی گئی
ہر سیاست رعونت میں بدلی گئی
مغربی حاکمیت کے تاوان میں
ایشیا کے بہادر جگر کر سلاسل میں پھانسی کے تختوں پہ لائے گئے
سنسناتی ہوئی گولیوں سے محبانِ مشرق کے سینوں کو چھیدا گیا ۔
زخم کھائے ہوئے نوجوانوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندا گیا ۔
انگلیاں اہلِ صنعت کی کاٹی گئیں
کھائیاں سرد لاشوں سے پاٹی گئیں
زیردستوں کو جیلوں میں ڈالا گیا ۔
سر اڑائے گئے خون اچھالا گیا ۔
عورتوں کو سرِ عام لایا گیا ۔
زندگی کا تمسخر اڑایا گیا
کتنی چیخیں گلے میں دبا دی گئیں کتنے سینوں پہ خنجر چلائے گئے
بیگناہوں کے خونِ رواں سے زمینِ عجم لالہ زارِ عجم بن گئی

اور اہلِ عجم کیلئے اک مصیبت کا ساماں بہارِ عجم بن گئی
ہند و ایران کی عظمتیں خاک میں مل گئیں
سرزمینِ عرب پر قیامت کے فتنے اٹھائے گئے
اس قیامت میں مصر و فلسطین کی رونقیں مٹ گئیں
اس تباہی میں شام و یمن لٹ گئے۔
ایشیا کی بھری انجمن لٹ گئی نوبہارانِ باغِ وطن لٹ گئے۔
زندگی لٹ گئی ہر چمن لٹ گیا جلوہ سامانِ بزمِ چمن لٹ گئے
اطلس و پرنیاں تو ہے اک طرف سرفروشوں کے خونیں کفن لٹ گئے

امن کے ڈاکوؤ! چین کے رہزنو!
تم نے اولادِ آدم کی توہین کی
تم نے طاقت کے بل پر غریبوں سے ٹھٹھا کیا۔
زندگی کے لبوں سے ہنسی نوچ لی
عصمتیں لُوٹ لیں عزتیں چھین لیں۔
تم نے لاکھوں کلیجوں کو گھائل کیا
تم نے ہونٹوں کو فریاد و زاری پہ مائل کیا۔
تم شکاری کی مانند مشرق کے چکر لگاتے رہے۔
زندگی کو نشانہ بناتے رہے۔
بیکسوں کا لہو بیچ کھاتے رہے
اور کمزور قوموں کی قسمت کے سودے چکاتے رہے
ایشیا کے ہر اک ملک میں اپنی سوداگری کے کرشمے دکھاتے رہے۔

دوسرا دور

میرے کھیتوں کے موتی بکھیرے گئے۔
میری دھرتی کے سینے کو چیرا گیا۔
میرے مشرق کی سب رونقیں لوٹ کر
ایک ڈالر کے سکے میں ڈھالی گئیں
اور ڈالر کے جادو کی ضربات سے جادوئے حسنِ مشرق کو توڑا گیا
تیل خوں کی طرح ایشیا کی رگوں سے نچوڑا گیا
اور اسی تیل سے ظالمو!
تم نے اس میری ارضِ حسیں کے گلستاں جلا کر بھسم کر دیئے
ہر طرف سرخ شعلوں کی خونیں زبانیں لپکتی رہیں
اور جھلسی ہوئی نیم مردہ سی انسانیت کے لبوں پر دھواں رقص کرتا رہا
اس جہنم کی بھڑکی ہوئی آگ میں
دل پگھلتے رہے —— جسم گلتے رہے
تم کو اپنے ہی جلووں سے مطلب رہا میرے مشرق کے ایمن تو جلتے رہے

ایشیا کی زمیں ایک جاگیر تھی جو لٹیروں میں تقسیم ہوتی رہی
زندگی کی ہر اک روشنی رفتہ رفتہ اندھیروں میں تقسیم ہوتی رہی
آخرِ کار چاروں طرف ظلم انگیز فتنوں کے بادل سے لہرا گئے
مشرقی آسماں پر غلامی کے منحوس پرچم افق تا افق چھا گئے۔
اس غلامی کے منحوس پرچم کی چھاؤں سے بچنے کی خاطر مگر
ایشیا کے جواں انقلاب اور بغاوت کے نعرے لگاتے ہوئے
حشر سا ایک ہر سو اٹھاتے ہوئے
رزمگاہوں میں سینہ سپر ہو گئے
چھنتی گولیوں سے مگر ان کے ہونٹوں پہ خوں رنگ مہریں لگائی گئیں
بوٹیاں ان کے جسموں کی ہر سو اڑائی گئیں
قید خانوں کے تاریک حجروں کے در کھل گئے

ہر طرف بیڑیاں جھنجھنانے لگیں
اور طوق و سلاسل کی آواز آنے لگی
زندگی خوف سے تھرتھرانے لگی
ماؤں بہنوں کی پرسوز چیخوں سے کہرام سا مچ گیا
اپنی ماؤں کو روتے ہوئے دیکھ کر نوشگفتہ سے بچے بھی رونے لگے
ہر طرف آنسوؤں کے دیئے جھلملانے لگے
آنسوؤں کے دیئے جھلملاتے رہے
اور بغاوت کے شعلے انہی آنسوؤں کی حرارت میں دم توڑ جاتے رہے

سالہا سال تم اہلِ مشرق کی خاطر قوانین کے جال بُنتے رہے
سالہا سال یورپ کا مارِ سیہ ایشیا کی جبینِ صداقت کو ڈستا رہا
سالہا سال مغرب کے منحوس پرچم یہاں پھڑپھڑاتے رہے
اور طوق و سلاسل کی جھنکار میں
ارضِ مشرق کے مجبور و بے کس مغنی نگاہیں جھکائے ہوئے
اپنی نمناک پلکوں پہ خوں رنگ سی مشعلیں جگمگاتے ہوئے
اپنے ٹوٹے ہوئے ساز اٹھائے ہوئے
اپنی کھوئی ہوئی زندگی کی دھنوں میں غم انگیز نغمے الاپا کئے
ہچکیاں لے کے فنکار روتے رہے
اپنے اشکوں سے دامن بھگوتے رہے
اور اُدھر مغربی رقص گاہوں میں تم ——
—— ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ بدن کو بدن کے حوالے کئے
آرگن کے نشیلے سُروں پر تھرکتے رہے ڈگمگاتے رہے
پاؤں اٹھتے رہے —— جسم ہلتے رہے
میرے مشرق کی دولت اجڑتی رہی اور مغرب کی قسمت سنورتی رہی

سالہا سال جبر و تشدد کا یہ رقص جاری رہا
سالہا سال ہم ایشیائی غم انگیز نغموں کی موجوں پہ بہتے رہے
اور رو رو کے یہ تم سے کہتے رہے
ہم کو لوٹی ہوئی زندگی سونپ دو —— ارضِ مشرق کو تابندگی سونپ دو
اس تمنا کو لیکن سیاست کی توہین سمجھا گیا
ایشیا کے ہر اک انقلابی کو ننگِ وطن، ننگِ آئین سمجھا گیا
اور مشرق میں کروٹ بدلتی ہوئی زندگی پر نئے ظلم ڈھائے گئے
ایشیائی ممالک کی انسانیت پر تشدد کے پہرے بٹھائے گئے
میرے مشرق کے خورشید توڑے گئے اور ظلمت کے طوفان لائے گئے
روشنی کی شعاعوں نے لیکن لپکنا نہ چھوڑا کبھی
میرے دانشوروں نے اندھیروں میں سینے کے داغوں کی لو سے اجالا کیا
اور اس روشنی کے سہارے مرا کارواں سوئے منزل روانہ رہا
ایشیا کے غیور انقلابی پھریرے سنبھالے ہوئے
گولیاں اپنے سینوں پہ کھاتے رہے
ہر قدم سوئے منزل بڑھاتے رہے
اک نئی صبح کی آرزو میں نئے گیت گاتے رہے۔

تیسرا دور

آخر کار وہ ساعتِ جانفزا آ گئی
تم قیامت سمجھ کر جسے اپنے وعدوں پہ ٹالا کئے
رات کی ظلمتوں کے افق پر سنہرے اجالوں کے آثار پیدا ہوئے
صبحِ زریں کے جلوے ہویدا ہوئے

میرے مشرق میں صدیوں کی مسحور انسانیت ہوش میں آگئی
چپکے چپکے رواں زندگی تلملا کر اٹھی جوش میں آگئی
ایشیا کے پھریرے نئی شان سے لہلہانے لگے
ہر طرف نوجوانوں کے گستاخ انبوہ بیباک نعرے لگانے لگے
ایشیا کی زمینوں کو خالی کرو
ایشیا ایشیا کے حوالے کرو
نوجوانوں کے نعروں میں دھرتی کے سینے کا طوفان تھا
اک نیا جوش تھا اک نئی روح تھی ایک ہیجان تھا۔
اور ان سرفروشوں کے نعروں کی ہیبت سے طوفاں مظالم کے رکنے لگے
کنگرے قصرِ شاہی کے جھکنے لگے
شہریاری کی نازک جبیں پر پسینہ سا آنے لگا
ایک منحوس تارہ افق پر لرزنے لگا جھلملانے لگا
مغربی حاکمیت کے بوڑھے قدم اک نئے خوف سے تھرتھرانے لگے
اور بصد حسرت و یاس رختِ سفر باندھ کر تم جزیروں کو جانے لگے
پھر بھی جاتے ہوئے تم نے جاگیرداروں سے سودا کیا
سامراجی نظامِ حکومت کے سانچے میں ڈھالے ہوئے کچھ نئے حکمراں
ایشیا کی زمیں پر مسلّط کئے
چند لرزاں اندھیرے شبِ عہدِ تاریک سے چھانٹ کر
میرے مشرق کے گردوں پہ پھیلا دیئے

ایشیا کے جواں پھر بھی مسرور ہیں
(زندگی سے ابھی گو بہت دور ہیں)
ان کی سعیِ جنوں تاز کچھ تو اثر اپنا دکھلا گئی۔
اور سیلِ بلا خیز میں ایک ساحل تو آیا نظر
روئے منزل اگرچہ نہاں ہے ابھی پردۂ رشتۂ منزل تو آیا نظر
یہ تباہی کا پُرہول دھارا جسے انقلابِ ظفریاب سمجھا گیا
یہ شفق رنگ خونیں اجالا جسے آفتابِ جہاں تاب سمجھا گیا
ایشیا کے افق سے ابھرتی ہوئی سرخ کرنوں کی خونریز یلغار تھی۔
سامراجی بساطِ سیاست کے نقشے کی اک آخری اور نئی چال تھی
آج جب یہ فریب آشکارا ہوا۔
وقت خود اپنی گردش پہ حیران ہے۔
زندگی سرنگوں ہے پشیمان ہے
اور ہر انقلابی کا اس بات پر آج ایمان ہے۔
موت کی گھاٹیوں سے اترتا ہوا
وقت کی سرحدوں سے گزرتا ہوا
انقلابِ جنوں خیز بھی آئے گا
آفتابِ سکوں ریز بھی آئے گا
اب کوئی تیرگی صبحِ نو کی کرن لوٹ سکتی نہیں
اب ابھرتے اجالے کی کوئی کماں ٹوٹ سکتی نہیں
آنیوالے ظفریاب سیلاب کو اب جہاں میں کوئی روک سکتا نہیں
اب سسکتی ہوئی تیرگی موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔
ارضِ مشرق میں چاروں طرف اک نئی زندگی لہلہائے گی اور——
——رقص فرمائے گی

سخت حیراں ہوں اس بات پر میں —— مگر
تم ابھی تک مرے ایشیا سے وفا کے طلبگار ہو۔
تم ابھی تک یہ امید باندھے ہوئے ہو کہ شاید تمہیں میرے مشرق——
—— میں پھر خواجگی مل سکے

اک نئی وجہ تاراجگی مل سکے۔

اور اسی ایک اُمید پر ساحرو!
مغربی انجمن میں مرے ایشیا کو بلاتے ہو تم
ہاں وہی مغربی انجمن جو سدا امن کی دشمنِ جان ثابت ہوئی
میرے مشرق کے حق میں ہمیشہ ہی جو ایک بندر کی میزان ثابت ہوئی
اب اسی انجمن میں مرے ایشیا کو بلاتے ہو تم
دام پر دام ہر سو بچھاتے ہو تم
اک مداری کی مانند اپنی سیاست کے منحوس ڈھکوسلے میں لاتے ہو تم
امن کے ڈاکوؤ! یاد رکھو مگر اب ستارہ تمہارے مقدّر کا گردش میں ہے
اور تہذیب کا چاند گہنا چکا
اب زمانہ تمہیں چھوڑ کر جا چکا
اب تمہاری تباہی کا وقت آ چکا
آج مشرق کے فرزند بیدار ہیں
آج سب مشرقی تم سے بیزار ہیں اور تم پر جھپٹنے کو تیار ہیں
آج ہر ایشیائی کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے
آج میرے مقدّر کے تارے فلک پر چمکنے لگے
ایشیائی تمہاری سیاست کے نقشوں میں اپنی رگوں کا لہو بھر چکے
آج تم سے نپٹنے کا وقت آگیا ہم جنوں کے فریضے ادا کر چکے

آج مغرب کا ہر سحر ناکام ہے۔
آج یورپ کی ہر تیرگی ایشیا کے اجالوں سے لرزہ براندام ہے
آج چاروں طرف پھیلتا جا رہا ہے مچلتا ہوا
اُس نئی زندگی کا نیا کھیل جو یانگسی کے کناروں پہ کھیلا گیا۔
آج ایراوتی کے نئے شوخ دھارے ظفریاب ہیں
آج گنگا و راوی کی موجیں اُچھلنے کو بیتاب ہیں
وادیٔ نیل میں نوجواں سر بکف پھر رہے ہیں پھریرے اٹھائے ہوئے
ارضِ پاژند کے حوصلہ مند انساں بھی ہیں اپنی ہمت بڑھائے ہوئے
آج تنکاک میں بھی بپا اک قیامت کا طوفان ہے۔
ہند چینی کے سینے میں ہیجان ہے۔
اور ولندیزیوں کا جنازہ تو مردانِ جاوا کے کندھوں پہ اٹھنے کو ہے
اوقیانوس کے پانیوں کی بھیانک سیاست کے جادو بکھر جائیں گے
برتری کے نشے سب اتر جائیں گے
ایشیا میں بغاوت کا امڈا ہوا تند طوفاں کناروں پہ آنے کو ہے
اک تباہی قیامت کا فرمان لیکر تمہاری بہاروں پہ آنے کو ہے

فکر تونسوی

نیا انسان

(۱)

اُسے دیکھ کر تم کہو گے ——

"یہ آدم کے بیٹے نے کیا رنگ پایا۔
خدا کی زمیں نے یہ کیس اجنبی گت پہ بربط اٹھایا۔
خدا کی زمیں گلتی سڑتی زمیں، خون بہاتی، کراتی زمیں اپنے آبا کی زریں امانت
بھلا کیسے چھیڑے گی اس اجنبی گت پہ اپنا ترانہ۔
یہ آدم کا بیٹا تو فطرت کا ہر نقش ہی کھو چکا ہے۔"

(۲)

تمہیں دیکھ کر وہ کہے گا ——

"میں ہیرو نہیں الف لیلہ کی افسوں بھری داستاں کا
کوئی اسمِ اعظم بھی میری توانا مسرّت کا مرکز نہیں ہے
تمہارا لہو ہی رواں ہے مری جھلملاتی رگوں میں۔
میری یہ نگاہوں کے آداب —— رفتار کے یہ قرینے
ہر اِک بات میں میری۔ آراستہ سا ترنم
ہر اِک سوچ میں میری یہ اجنبی سا سلیقہ۔
تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں یہ سپنے۔
کہ جن سے چمکتی رہی ہیں تمہاری ہزاروں ہی صدیوں کی تاریک نیندیں
میں آدم کا بیٹا تمہارے ہی آدم کا بیٹا!
مجھے یوں جو بیگانہ وش دیکھتے ہو۔
تم اپنے کو بیگانہ وش دیکھتے ہو۔؟؟"

(۳)

اُسے دیکھ کر تم کہو گے ——

"تم آئے تو اک زلزلہ ساتھ لائے۔
ہمیں تم نے لرزا دیا، کپکپایا، جھنجھوڑا، مروڑا،
ہماری رگوں میں تہ‌رلرے آتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک بھرے ہیں طرارے۔
بھلا یوں غنیموں کی مانند بھی کوئی آتا ہے اپنا
بھلا یوں محبت بھی کرتا ہے کوئی —— کہ چولیں ہلا دے۔
بڑے ہی مگن تھے —— زمانے کے مانوس، دائم ترنم پہ سر دھن رہے تھے
عجب نیند تھی —— غم بھی غم تھا، خوشی بھی خوشی تھی،
اگر زندگی آتی، آغوش کھلتی —— اگر موت آتی، نگاہیں بچھاتے۔
تم آئے تو اک زلزلہ ساتھ لائے۔
اُدھر دیکھتے ہو، اُدھر دور —— وہ اک پہاڑی کی چوٹی۔
یہاں اک سنہری کلس تھا، شہنشاہ کے سر کی زینت۔
وہ اب زینتِ خاک و خوں ہو گیا ہے۔
اِدھر دیکھتے ہو —— شجرہائے سایہ فگن کی جڑیں ہل گئی ہیں۔
پہاڑوں کی سنگین چھاتی میں گھاؤ پڑے ہیں۔
سمندر کی نچلی تہیں تک اُبل کر، کناروں کو چھونے لگی ہیں۔
اُدھر اک پجاری کے دو ہاتھ بہرِ دعا اٹھ رہے تھے، ڈھلک سے گئے ہیں
اِدھر ایک معبد کا ناقوس بجنے کو اُٹھا —— اٹھا تھم گیا، جم گیا ہے۔
اُدھر ایک دانائے رازِ دروں، اک گرہ کھولتے کھولتے ہم رک گیا ہے
اِدھر سطح پر تیرتے تیرتے چند تنکے جو ڈوبے —— تو بس ڈوب کر رہ گئے ہیں
اُدھر کھیت سے ایک گندم کے خوشے نے پلکیں اٹھائیں —— تو اٹھتی گئی ہیں۔

اُدھر تلملاتے دھوئیں کی لکیریں جو پھیلیں — تو اُٹھتی گئیں آسمان پر
ہماری ہر اک چال، ہر سوچ، ہر بول کو تم نے جھٹکا دیا ہے۔
تمہارے تو اس زلزلے نے ہماری تمنا تلک کو بھی بہکا دیا ہے"

(۴)

تمہیں دیکھ کر وہ کہے گا —
"— محبت کے آدابِ نو کا گنہ گار ہوں میں
تمہارے لئے کب تلک زینتِ خواب رہتا۔
تمہارے تو بوڑھے بتوں کے تلے میرا دم گھٹ رہا تھا
تمہاری عبادت کا لمبا تسلسل، مجھے ایک دیوار سا بن گیا تھا۔
تمہارے خداؤں کے بس میں جو ہوتا،
مجھے اور کچھ دیر بیگانگی کا لبادہ پنھاتے۔
مگر وقت کا راگ، رُوحِ زمیں میں بگولا بنا جا رہا تھا۔
بگولا — تمہارا بگولا، جواب زلزلہ بن گیا ہے،
اُسے اجنبی کہہ رہے ہو، مجھے اجنبی کہہ رہے ہو؟
تم اپنی تمناؤں کے عکس کو اجنبی کہہ رہے ہو۔؟؟ —"

(۵)

اُسے دیکھ کر تم کہو گے —
"— تمناؤں کا عکس، اُس اسمِ اعظم سے بڑھ کر نہ ہوگا۔
جو صدیوں سے دامِ مسرت بچھاتا رہا ہے۔
نہیں اپنی تقدیر میں خواب ایسا،
ہمیں جلتے میں بنا دے جو افسانۂ الف لیلہ کا ہیرو
اگر تم وہی خواب ہو جس کی تعبیر بھی خواب ہوگی۔
تو اے زلزلے کے پیمبر!
نہ ہم سے کہو وہ محبت — جو چولیں ہلا دے
ہمیں خود سے بیگانہ کر دے ہمیں ناشناسا لبادہ پنھا دے

(۶)

تمہیں دیکھ کر وہ کہے گا —
"— تمہارا ہر اک بول ماضی کی لہروں کا راہی
مری سوچ کی لہر کے راستے میں کوئی خوابِ تقدیرِ بیگانگی — کچھ نہیں ہے۔
مری سوچ میں ایک انسان ہے — پھیلے پھیلے سمندر کی مانند
جس میں نہ کوئی چٹان اور — مگر مچھ، جزیرہ، نہ ٹیلہ۔
مری سوچ میں کوئی آگے نہ پیچھے نہ اُوپر نہ نیچے،
مری سوچ آدابِ نو کی ہے پابند۔
تمہارا ہر اک بول — ماضی کی لہروں کا راہی
تمہیں تو مری بات اک سایۂ خواب معلوم ہوگی۔
میں گذروں گا جب لہلہاتی ہوئی کھیتیوں سے۔
میں چھوؤں گا جب گڑگڑاتی مشینوں کے بازو۔
میں پوچھوں گا جب چیتھڑوں سے فسردہ کہانی
میں روکوں گا جب حُسن کی آنکھ سے آنسوؤں کی روانی۔
میں گاؤں گا جب گنگ، خاموش، بے حِس فضا میں۔
تو تم سب کہو گے، یہ آدم کے بیٹے نے کیا رنگ پایا؟
مگر میں گذرتا رہوں گا۔
کسی کے تحیّر پہ میں کیوں ٹھٹکتا رہوں گا؟
خدا کی زمیں — اپنے آبا کی زرّیں امانت کا وارث،
گذرتا رہے گا — محبت کے پھیلے سمندر میں گاتا رہے گا۔
یہی اجنبی گت، یہی ناشناسا ترانہ،
جو اک دن شناسا نگاہوں کا ہمراز بن کر
ہر اک نقشِ فطرت کا غمّاز بن کر
توانا مسرّت کا اک جاگتا، ناچتا اسمِ اعظم بنے گا —!!

جگن ناتھ آزاد

اے امیرِ کارواں!

اے امیرِ کارواں
اضطراب اہلِ کارواں بھی دیکھ
دیکھ کر خلوصِ اہلِ کارواں
ہو نہ اپنے دل ہی دل میں شادماں
پیچ و تاب اہلِ کارواں بھی دیکھ
اے امیرِ کارواں

(۲)

اے امیرِ کارواں
کارواں کے پاؤں میں تھکن سی ہے
کارواں کی آنکھ میں چمک نہیں
کارواں کے عزم میں دمک نہیں!
کارواں کے روح میں جلن سی ہے
اے امیرِ کارواں

(۳)

اے امیرِ کارواں
راستے میں کارواں نہ بیٹھ جا
جا چکا ہے نہ قبلے کا وہ شباب
چپ ہیں آج نعرہ ہائے انقلاب
اٹھ رہا ہے ایک شور ہائے ہائے
اے امیرِ کارواں

(۴)

اے امیرِ کارواں
زندگی کا اک نشاں سا رہ گیا
سرد ہو گئی ہے ولولوں کی آگ
بجھ چکی ہے تند حوصلوں کی آگ
آگ بجھ چکی دھواں سا رہ گیا
اے امیرِ کارواں

(۵)

اے امیرِ کارواں
اپنے گرد و پیش کا مآل دیکھ
داستاں ہے اک نئی شروع دیکھ
صبحِ نو کا چرخ پر طلوع دیکھ
بے بسوں کی رات کا زوال دیکھ
اے امیرِ کارواں

(۶)

اے امیرِ کارواں
رنگ کی لہو کی ندیاں بھی دیکھ
اک نئی ضیا ہوئی ہے جلوہ گر!
مغربی افق پہ تابہ کے نظر
اک نگاہ سوئے خاوراں بھی دیکھ
اے امیرِ کارواں

اضطرابِ اہلِ کارواں بھی دیکھ — اے امیرِ کارواں!

دانش ممتاز

آخر کار

سالہا سال عقابوں نے نوالے چھینے
بھوک کی آگ میں جلتا رہا جسمِ انساں
دل پہ چھاتا رہا ناکامیِ کاوش کا غبار
وسعتِ کون و مکاں بن گئی آدم کا مزار

سالہا سال اُمیدوں کے نہاں خانے میں
وہم آلودہ دھندلکوں میں اُلجھتی سی کرن
زندگی چاکِ گریباں کو رفو کرتی رہی!
ہر گھڑی قصۂ بیداد بیاں کرتی رہی

آخر کار نئی صبح نے انگڑائی لی
لحظہ لحظہ نئے افکار کی محرابوں پر
ہر حقیقت سے سرکنے لگی ظلمت کی نقاب
اک نئی شان نئی آن سے اُبھرا مہتاب

زمزمہ خوشوں کی نگاہوں میں جوانی جاگی
زندگی اپنی توانائی کے نغمے گا کر
رقص کرنے لگی دہقان کے کھیتوں میں بہار
لیکے اک سیلِ مسرت بڑھی عشرت بکنار

خندہ زن آدمِ خاکی کی پذیرائی کو
سالہا سال کی تخلیق کا حاصل بنکر

بلراج کومل

شعلۂ لذت

صدیوں سے انساں احساسِ لذت پہ مرتا آیا
صدیوں سے لذت کی خاطر نئے نئے طوفان اٹھے
کبھی اسے معلوم نہ تھا، لذت کی ترنگیں کیسی ہیں؟
جانے کیسے جنم لیا لذت کے تصور نے پہلے
اور اسی احساس نے اس کے جسم میں لہریں دوڑا دیں
اور اسی احساس کے پھر نکلے کتنے ہی پر پرزے
لذت کی خاطر لاکھوں ہی نئے جتن ایجاد ہوئے
سینوں کی مینائیں چھلکیں، زلفوں کے بادل امنڈے
ہونٹوں میں نرمی مسکائی، آنکھوں میں مستی بہکی
دھڑکن نے دھڑکن کو چوما، ساغر و مینا جھوم گئے
شعلے سے گالوں میں ناچے، تارے سے پلکوں پہ سجے
بھری بھری باہیں لہرائیں، بربط میں تانیں تڑپیں
سیم و زر کی جھنکاریں بھی گونجیں من کے مندر میں
لذت کے بازار لگے، جسموں کے سودے عام ہوئے
ایک ایک نئے آنچل میں لذت روپ دکھاتی رہی

(۲)

جسموں کے ٹکڑے بھی ہوئے اور لاشوں کے انبار لگے
شعلوں میں بچے بھی جھلسے، رقصِ حیوانی بھی ہوا
تلواروں کی نوکوں پر عصمت کی کرنیں بھی تڑپیں
جلتی آگ کے منڈپ میں جسموں کی قاشیں بھی بٹیں
عریاں جسم بھی بازاروں میں لذت کا سامان بنے
کٹے پھٹے پستانوں سے کتنے ہی سندر ہار بنے
ماؤں کی کھوپڑیوں میں بیٹوں کا خون پلایا گیا
نیزوں پر انسان سجے اور محفل "رنگ و نور" جمی
بھنی ہوئی باہوں، رانوں کی ہونٹوں نے لذت بھی چکھی
چھریوں نے جسموں کو چھیلا، موت کو بھی آسان کیا
سینوں پر ہاتھی بھی ناچے، شیروں کو کھانا بھی ملا
پربت سے انساں بھی لڑھکے، ساگر کی لہروں میں گھلے
یہاں وہاں کونے کونے میں نئے نئے اسرار کھلے
ایک نہ ایک نئے آنچل میں لذت روپ دکھاتی رہی

(۳)

آج بھی لذت کے احساس میں لہریں سی، سہم اٹھتی ہیں
آج بھی انساں لذت کے احساس پہ قرباں ہوتا ہے
آج بھی لذت نئے نئے پردوں سے آنکھ لڑاتی ہے
پھر کیسی امید کہ اب دنیا میں نہ طوفاں اٹھیں گے
پھر کیونکر یہ شور کہ ہم نے درد کا دارو ڈھونڈ لیا
لذت کا احساس اگر فانی ہوتا تو ممکن تھا
بیماروں کی دنیا کو دکھ دردوں کا مداوا مل جاتا
لذت کا احساس مگر فانی ہی نہیں!!!

شاد عارفی

حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور

حالی

لفظی ڈھونگ، ریاست کیسی! مفت ملے وہ دولت کیسی؟
دولت سب کچھ، عزت کیسی؟

رمزِ وفا ہے، غیبت کیسی؟ قوم کہاں کی ملت کیسی؟
شہرت سمجھو لعنت کیسی؟

گونگوں میں ہڑبونگ مچا ہے بہروں کا بازار لگا ہے
شکوہ ہو کہ شکایت کیسی؟

آزادی جنتی ہیں قومیں! نفرت سے بنتی ہیں قومیں
نفرت کیجے، الفت کیسی؟

جھوٹوں پر سبقت لینی ہے باطل سے اُجرت لینی ہے
سچ کہنے کی عادت کیسی؟

"بھینٹ پہ چڑھنے والی بھیڑو!" ساز جہل و حماقت چھیڑو
سعیِ پیام حکمت کیسی؟

نا اہلوں کے صدقے جاؤ کھاؤ طپانچے، رتبے پاؤ
کیا فرمایا۔ ذلت کیسی؟

"مجرا عرض کرو ٹھوکر پر!" غداروں کے چرچے گھر گھر
غداروں پر لعنت کیسی؟

بندھ جائیں سو موتی لیکن آب مگر موتی کی۔ کَے دن
قوم کے اندر وحدت کیسی؟

کڑوی بات کسے بھاتی ہے شاد خوشامد بھی آتی ہے
فن پر تجھ کو قدرت کیسی؟

نور بجنوری

پاداش

دریچے ٹوٹتی انگڑائیاں بن کر لچک جائیں
مگر پیشانیٔ سیمیں کا تل ہنسنے نہ پائے گا
جواں راتوں کا سناٹا خماریں گیت بکھرائے
تری زرکار خلوت میں کوئی طوفاں نہ آئیگا
اُدھر پائل کی چھن چھن مضطرب لہجے میں چیخے گی
"یہ آخر کیا کیا۔ یہ کیا کیا۔ یہ کیا کیا میں نے"
اِدھر جھنجلا کر اک سونے کی مورت بول اُٹھیگی
"بہت اچھا کیا۔ اچھا کیا۔ اچھا کیا مَیں نے"
ترے انگ انگ سے رِستے ہوئے نغمے پکارینگے
"مغنّی! اس سنہرے خواب کو پیکر عطا کر دے"
حنائی انگلیاں گھونگھٹ کی مہکاروں سے پوچھینگی
"کوئی اِن یخ زدہ بانہوں میں جیسے بجلیاں بھر دے!"
دریچے ٹوٹتی انگڑائیاں بن کر لچکتے ہیں
مگر پیشانیٔ سیمیں کا تل ہنسنے نہیں پاتا
جواں راتوں کا سناٹا خماریں گیت گاتا ہے
تری زرکار خلوت میں کوئی طوفاں نہیں آتا

سرباز ہاشمی

ایک عہد

وہ مجھے کل بھی ملی تھی مگر اک اور کے ساتھ
اُس کی آنکھوں میں وہی پیاس نظر آتی تھی
عشق مایوس سا تھا حُسن کی خاموشی پر
ساتھیو داد تو دو! اس کی جنوں کوشی پر
اُس نے کل بال سنوارے تھے نئے طور کے ساتھ
وُہ مجھے کل بھی ملی تھی، مگر اک اور کے ساتھ

اور میں کل سے پریشاں سا ہوں خاموش سا ہوں
زندگی مجھ کو تھکا دے گی یہ معلوم نہ تھا
وہ جوانی یہ صلہ دے گی یہ معلوم نہ تھا
اب کبھی عشق کروں گا تو بڑے غور کے ساتھ
وُہ مجھے کل بھی ملی تھی، مگر اک اور کے ساتھ

کوشن موہن ایم۔ اے

غزل

وہ البیلی پریم آشائیں، یہ ویرانی بجائیں بجائیں!
چڑھتا سورج جگمگ جگمگ، ڈھلتے سائے، سائیں سائیں!

جیون بازی ہار چکا ہے، کاماؤں کو مار چکا ہے
کامنائیں پژمردہ شاخیں، بیتے جگ کا سوگ منائیں

بوڑھا برگد بے حس جوگی، کھوئی کھوئی اس کی جٹائیں
کھوئے کھوئے ویران بن میں جلتی ہیں کتنی ہی چتائیں

بیتیں پریم اور پریت کی راتیں، سوپن ہوئیں میٹھی باتیں
پھر یہ چھاتی کی رنگیں گھاتیں بیت چکیں، اب کیسے آئیں!

پیچھے گلشن آگے صحرا، راہی سے کہتے ہیں چھلاوے
انگ انگ میں، بال بال میں آؤ غم کی راکھ رمائیں

پھیلے پھیلے وقت کے صحرا، بڑھتی بڑھتی یہ دنیائیں
راہی رستہ بھول گئے ہیں، چھائی ہیں کچھ ایسی گھٹائیں

حسن کے دل میں درد نہ آئے، عشق کو حسن کی یاد ستائے
یہ کیا ڈھب ہے، لطف تو جب ہے بھولنے والے یاد نہ آئیں

دھرتی کی کومل چھاتی پر انسانوں نے کانٹے بوئے!
دھرم کی آڑ میں خون کی ہولی کھیل کے انساں دل بہلائیں

جمیل ملک

•

آلام ستاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
جی بھر کے رلاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
ہم اُن کی حسیں یاد میں کھو کر غمِ دوراں
یہ مان بھی جاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
مَیں لاکھ سمجھتا ہوں کہ تو پاس ہے لیکن
حالات بتاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
یہ موسمِ رنگیں، یہ جنوں خیز نظارے
کیوں یاد دلاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
کرتا نہیں کوئی بھی علاجِ غمِ فرقت
سب دل کو دکھاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
تو مطمئن اِس سے ہے کہ ہم دُور رہیں تجھ سے
ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے
یہ اشک، یہ ناسُور، یہ کچلے ہوئے ارماں
دنیا کو بتاتے ہیں کہ تو پاس نہیں ہے

ضمیر اظہر

•

چمن چمن میں ترا ذکر عام کرتے ہیں
کبھی صبا کبھی گل سے کلام کرتے ہیں
ترے خیال کا رنگین آسرا لے کر
کنارِ رنگ شفق میں قیام کرتے ہیں
کچھ ایسے لمحے بھی آتے ہیں ہجر میں جب ہم
ترے بغیر بھی تجھ سے کلام کرتے ہیں
وہ رسمِ عشق و محبت سے آشنا ہی نہیں
جو رسمِ عشق و محبت کو عام کرتے ہیں
ہے کس کا فیضِ تصور کہ آج مجھ کو ضمیر
مہ و نجوم بھی جھک کر سلام کرتے ہیں

قتیل شفائی

غزل

دل وہ حقیقت ہے کہ جسے احساس و نظر تسلیم کریں گے
کیا غمِ جاناں کیا غمِ دوراں سب اس کی تعظیم کریں گے

یہ آنسو یہ دل کے ٹکڑے، کب تک دینگے ساتھ ہمارا
یا ہم اِن کو پی جائینگے، یا سب میں تقسیم کرینگے

جنگل جنگل، صحرا صحرا، یہ انبار گریبانوں کے!
سنتے ہیں کچھ دیوانے دیوانوں کی تسلیم کرینگے

آہ یہ عزمِ ترکِ محبت! یُوں ہم کو محسوس ہُوا ہے
جیسے بہتی ندّی کے پانی کو ہم دونیم کرینگے

آ اِس دنیا کو ہم اپنے دل کی بات بتا دیں ورنہ
لوگ ہمارے افسانے میں جانے کیا ترمیم کرینگے

ابن انشاء

خزاں کے گیت

(چند چینی نظمیں)

گھاٹی میں پیڑوں کے گرانے کی آوازیں
گونج رہی ہیں۔
کتنی کھیتی کاٹ چکی دہقاں کی درانتی
تھک بھی گئی ہے۔
ٹوکریوں میں خربوزے اور جھاڑوں کے پھل
بکنے لگے ہیں۔
پت جھڑ کی رُت، اوس کے موتی بکھراتی ہے
پھر آتی ہے۔
دہقاں کی کھیتی کا چکّر کاٹ رہی ہے

خزاں کی رُت آئی ہے اور اس نے دہقانوں کی کھیتیوں کے چکّر کاٹنے شروع کر دیئے ہیں۔ درانتیاں ایک طرف رکھ دی گئی ہیں۔ اب ان سے اگلی فصل ہی کام لیا جائے گا۔ کسانوں اور کھیت مزدوروں نے تربوز، خربوزے اور جھاڑیوں کے رنگا رنگ کے پھل ٹوکریوں میں بھرنے شروع کرتے ہیں۔ اب یہ پھل بازار میں جائیں گے اور ہاٹ ہاٹ پر بکیں گے۔ اُدھر جنگل میں درختوں کے پیلے پیلے پتّے ڈھیریوں کی صورت میں جمع ہو رہے ہیں۔ بوڑھے درخت تو بالکل ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں۔ اور اب انہیں گرایا جا رہا ہے۔ کلہاڑوں کی کھٹ کھٹ کی آواز گھاٹی کی گہرائیوں میں گونج رہی ہے۔ اور خزاں کی اداس فضا میں ارتعاش پیدا کر کے پھر گم ہو جاتی ہے۔ یہ غالباً صوبہ زیچواں کی خزاں ہے۔ اور زیچواں دُور مغرب میں واقع ہے۔ جہاں اس نظم کے شاعر ہوچی فینگ نے اپنی زندگی کے پہلے پندرہ برس گزارے ہیں۔ کھیتوں سے گزر کر پت جھڑ کا قافلہ دریاؤں اور جھیلوں کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ چین میں بھی خزاں کے ڈانڈے سردیوں سے اس طرح ملے رہتے ہیں کہ ان کے درمیان شاید کوئی خط کھینچنا آسان نہیں۔ پھر اب آپ پت جھڑ کو اس کے نئے میدان میں دیکھئے۔ اور یہ کسی ندی نالے کا ساحل ہے۔

پھینک رہے ہیں ———— دریاؤں میں جال مچھیرے
ہاتھ لگیں گے ———— پیڑوں کے سوکھے ہوئے پتّے
بوڑھے مانجھی ———— ہولے ہولے ناؤ کھینے
گھر کو چلے ہیں ———— ان کی جھونپڑیاں اور خیمے

دُھند کی اِک چِٹّی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں

پت جھڑ کی رُت

ملاحوں کی ناؤ سے چکّر

کاٹ رہی ہے۔

—— اور پھر دریاؤں جھیلوں اور ندی نالوں کے ساتھ وہ چراگاہیں بھی پت جھڑ کے تصرف میں آجاتی ہیں۔ جہاں راتوں کو چرواہوں کی بنسریاں گونجا کرتی تھیں۔ گرمیوں کی راتوں کی وہ سوندھی سوندھی خوشبو بھی اب غائب ہو جاتی ہے۔ جو خشک مٹی پر برسات کے کسی بھولے بھٹکے بادل کے چھینٹوں سے اٹھا کرتی تھی۔ اور بستی تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

کھلی چراگہ میں جب ٹڈے چلاتے ہیں۔

اِس کی ویرانی کو اور بڑھا جاتے ہیں

ندی کی تہ میں جو پتھر جھانک رہے ہیں

ندی کے اُجلے پانی کو چمکاتے ہیں

چرواہوں کی بنسریاں خاموش ہوئی ہیں

ایسے میں یہ لوگ کہاں کھوئے جاتے ہیں

گرمی کی راتوں کی خوشبو

کہاں گئی ہے

چرواہی کی آنکھوں میں پت جھڑ کی اداسی

اونگھ رہی ہے۔

شاعر سوچ رہا ہے کہ وہ چرواہے جن کی تانیں بہار کی راتوں کی جان ہوتی ہیں۔ خزاں کی آمد کے ساتھ کہاں کھو جاتے ہیں۔ اُدھر چرواہی کی آنکھوں میں بھی پت جھڑ کی اداسی جھلکنے لگی ہے۔ رومان کُند ہو جاتے ہیں۔ اور کجلائی ہوئی محبتوں کو اگلی بہاروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ایسے میں ہمارا دوسرا شاعر لن کینگ آتا ہے۔ یہ بہت شرمیلا شاعر ہے۔ اس کی زبانی خزاں کی داستاں سنئے تو وہ صحرا میں کسی ابر پارے کا سایہ معلوم ہوتی ہے۔ جو اس طرح گزرجاتا ہے کہ اس کا وجود ہی موہوم معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ شاعر ارضِ شمال پیکن سے آیا ہے۔ جہاں یہ ۱۹۱۰ میں علماء کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اسے چینی اور ہندوستانی فلسفے پر سند سمجھا جاتا ہے۔

پت جھڑ کے دِن آئے

چمن ویران پڑا ہے۔

آسمان نے نیلا جامہ

پہن لیا ہے۔

ایسے میں کیا بات کریں۔

کیا سوچے جائیں

اُکتا جاؤں
پھر اپنے گھر واپس آؤں۔
پھر سجنی پر جھک جاؤں
اور نیر بہاؤں۔

یہ شاعر نہ گھاٹی میں درختوں کے گرائے جانے کی آواز ہی سنتا ہے۔ اور نہ خزاں کے دنوں میں ندیوں اور نالوں کے چکر کاٹتا ہے۔ بلکہ چمن کی ویرانی اور آسمان کے نیلگوں لباس کو جو اس کے دل میں اداسی پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہ سوچ کر مایوس ہو جاتا ہے۔ کہ ایسے میں کیا بات کریں۔ کیا سوچے جائیں۔ اس کے بعد وہ گھبرا کر پھر اپنے گھر واپس آجاتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ کے اوپر جھک کر آنسو بہانے لگتا ہے۔ لیکن یہ آنسو بہانے کی واردات، خوب رہی۔ یہ چینی شاعر بھی ایک ہی گھُنّے ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بہت دور تک چلیں گے۔ لیکن اس کے بعد یک لخت ایک مقام پر آپ سے اس طرح جدا ہو جائیں گے۔ کہ آپ کو چینی کی علیحدہ شخصیت کا قائل ہونا پڑے گا۔ کیا یہ نظم انگریزی ہو سکتی ہے۔ فارسی ہو سکتی ہے۔ فرانسیسی یا ہسپانوی ہو سکتی ہے!

اسی شاعر کی زبانی خزاں کی ایک اور داستان سنئے۔ (اس نظم کا ترجمہ نثر میں ہے)

خزاں کے دن ہیں۔
جنگل میں آسمان چمکیلا اور بلند نظر آتا ہے
سال کے درخت کے سرخ پتے زمین پر بکھرے ہوئے ہیں
کوئی لمبا سا جھاڑو لے کر گرے ہوئے پتوں کو راستے سے ہٹا دے۔
ایک ہری وردی والا ڈاکیا جنگل میں سے گزرتا ہے۔
سفید سفید بادل درختوں کے اوپر تیز تیز بھاگنے لگتے ہیں۔
کیا وہ دریا کے اوپر اڑیں گے؟
ایک شخص جو ہر روز جنگل میں ٹھہر کر دم لیتا ہے۔
پتوں کے درمیان دھیان میں مگن ہو کر اپنا آپ کھو بھی سکتا ہے۔

یہ شاعر تو وہی ہے۔ لیکن یہ خزاں وہ نہیں ہے۔ شاید اُس سے اگلی رُت کی بات ہوگی۔ جب شاعر کی سجنی اس کی دسترس سے کم از کم اتنی دور ہوگی۔ کہ وہ محض نیلگوں آسماں اور ویران چمن کو دیکھ کر گھر نہ بھاگ جائے۔ اور رومانی آنسو نہ بہانے لگے۔ اس رُت میں وہ سال کے درختوں کے سرخ پتے بھی دیکھ لیتا ہے۔ اور ہری وردی والے ڈاکئے کو بھی جنگل سے گزرتے دیکھ لیتا ہے ———————— اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ اب اُسے سجنی کے پاس نہیں جانا ہے۔ بلکہ انہی پتوں کے درمیان کھو جانا ہے۔ جہاں وہ ہر روز جنگل میں تھم جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ستاتا ہے۔

یہی شاعر پیکین کی بہار اور خزاں کے مناظر کو ایک تیسری نظر سے بھی دیکھتا ہے۔ لیکن اس میں بھی پہلی نظم کی طرح داخلیت کا رنگ غالب ہے۔ یہ نظم بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ اور باہر کی دُنیا کے محسوسات اس تک اپنی راہ صرف کھڑکی کے راستے پاتے ہیں۔ تقابل کے لئے آپ پہلے اس نظم کے پہلے دو بند سنئے۔ جو بہار کے بارے میں ہیں۔

رات کے وقت جب سنسناتی ہوئی

تو درختوں میں سیٹی بجانے لگے

کوئی پنچھی کہیں چہچہانے لگے۔

اور کھڑکی کے باہر سمٹتی ہوئی

سونے والوں کی آوازیں گھلتی رہیں

(کوئی روتا رہے۔ کوئی گانے لگے)

یہ بہار کی آمد آمد کی پہلی منزل ہے — کھڑکی کے باہر سوتے ہوئے لوگوں کی بھانت بھانت کی آوازیں کچھ اس طرح گھل مل کر آنے لگتی ہیں۔ کہ اُن میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لو درختوں میں سیٹی بجا رہی ہوتی ہے۔ اور باہر اور بہت سی باتوں کا خروش کانوں کو رونے اور گانے کی مبہم آوازوں کے امتیاز کی اجازت نہیں دیتا۔

ایسا معلوم ہونے لگا — آدمی

جیسے اُوپر فضا میں اڑا جا رہا ہو

رات تاریک ہے — رات خاموش ہے

بانس کے سائے کیوں کپکپانے لگے

مٹھی بھر لو تو کچھ ہاتھ آتا نہیں

ایک احساس ہے (اور وہ جاتا نہیں)

جیسے ہر چیز دنیا کی پہنائی کی

پنکھ پھیلائے اور اڑ کے جانے لگے

یہ بھی بہار ہی کی ایک منزل تھی — اُس کے بعد خزاں کی روداد سنئے۔

چاندنی رات ہے

اور جنگل کی ویرانیوں سے کہیں

ایک جھینگر کی آواز آنے لگی

لو ہوا ناچنے کسمسانے لگی

اور چناروں سے پتّے بھرّانے لگی

لو خزاں آگئی

لو بہاروں کے دن بھی ٹھکانے لگے

لو خزاں آگئی۔

اب ہم لی کوینگ سے جدا ہوتے ہیں۔ ہمارا اپنا شاعر شو چو ہمیں آدھی رات کو ایک خزاں زدہ ویران گلی کے ایک کونے میں لے جاتا ہے۔ لیکن اسکے منظر کے ساتھ ایک درد آمیز رومان بھی لپٹا ہوا ہے۔ آپ یہ داستان اسی کی زبانی سنئے۔

دور گلی کے اِک کونے میں

آدھی رات کو

لمپ کی روشنیوں کے حلقے

مدھم مدھم

— اُونگھ رہے ہیں۔

گہرے ہیں اشجار کی شاخیں

لپٹی ہوئی ہیں۔

سارے رستے دُھندلاتے ہیں

کوئی مسافر ایسے میں رہ بھول نہ جائے۔

ہائے پاپی کیوں، ہاتھ مرے یہ ظلم کمایا،

روتی رہی وہ — کوئی جواب آنا تھا نہ آیا،

بادِ سحر پیڑوں کی پھننگیں چھو کر گزری

پتلے پتلے نوکیلے شرمیلے پتے

پھڑ پھڑ کرتے فرشِ زمیں پر آن گرے ہیں

یہاں نظم ختم ہوجاتی ہے۔ آدھی رات کے بعد صبح ہوجاتی ہے۔ اور بادِ سحر پیڑوں کی پھننگیں سہلاتی ہوئی آگے گزرجاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہی سوچتا چھوڑ جاتی ہے۔ کہ وہ عورت کون تھی۔ جس کے ساتھ کسی پاپی نے کوئی ظلم کمایا ہے۔ اور یہ پاپی کون ہے۔ شاید اس قسم کی واتوں میں ایسے پاپیوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے۔ کہ ہمارے شاعر نے اس کے متعلق کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا اور چینی شاعروں کی روایتی کم گوئی سے کام لے کر ایک چلتا ہوا اشارہ کرکے آگے گزرگیا ہے۔ اس نظم کے پڑھنے کے بعد جہاں لمپ کی روشنیوں کے حلقے۔ گہرے ہیں لپٹی ہوئی شاخیں اور بادِ سحر کی فہمائش سے لرزاں پھننگیں ہمیں بھول جاتی ہیں۔ وہاں اس روتی ہوئی بےبس عورت کی بات دل میں پھانس بنکر اٹک جاتی ہے — اس فریاد کا کوئی جواب بھی نہیں آیا اور آیا بھی کہاں کرتا ہے! یہ صوبہ چیکیانگ کی خزاں تھی جو چین کا ایک مشرقی صوبہ ہے۔

آئیے یہاں آپ کو ایک نئے شاعر سے ملائیں۔ اس کا نام ہے پائن چہ لن۔ یہ شاعر بھی ایک مشرقی صوبہ کیانگسو کا رہنے والا ہے۔ جو چیکیانگ کے پڑوس میں واقع ہے۔ اسے بودیلیئر اور فرانسیسی علامت پسندوں سے (خصوصاً ان کی ٹکنیک سے) گہری دلچسپی ہے۔ وہ دوسروں سے علیحدہ رہ کر چینی شاعری میں ایک نیا موڈ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے میلارمے کی نثریہ نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ اتفاق سے اس کی نظموں کے مجموعے کا نام بھی "خزاں کی تین رُتوں کے پتے" ہے۔ یہ شاعر اپنے ماضی پر ایک مسن آدمی کی سی نظریں ڈالتا ہے۔

اک مُسن آدمی کی نظروں سے

اپنے ماضی پہ ڈالتا ہوں نگاہ

ہر قدم پر بسیط صحرا ہیں

کوئی چشمہ نہ کوئی برگ و گیاہ

چونک اٹھا ہوں خوابِ برہم سے
کس کی آواز سُن رہا ہوں میں
آسماں پر تھکے تھکے کوّے
شام کے ساتھ ساتھ چھائے جاتے ہیں

یہاں تک بس ایک رُوداد ہے۔ ایک خوابِ پریشاں کی۔ اس مُن آدمی کو اپنے ماضی میں جگہ جگہ صحرا نظر آتے ہیں۔ اور چشموں یا برگ و گیاہ کی تلاش ایک سودائے موہوم بنکر رہ جاتی ہے۔ اسکے بعد وہ چونکتا ہے تو شام آسماں پر چھا رہی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ تھکے تھکے کوؤں کی کچھ ڈاریں نظر آتی ہیں۔ جو شاید قافلے بنا کر جنگل میں اپنے ٹھکانوں کی طرف پرواز کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں — ان کوؤں سے ہٹ کر اس کی آنکھیں در و دیوار پر جاتی ہیں جہاں ڈوبتے سورج کی دُھوپ اُسے تپِ دق کے کسی بیمار کی یاد دلاتی ہے۔

پیلی کرنوں سے ڈوبتا سورج
سقف و دیوار جگمگاتا ہے

جیسے بیمار کوئی برسوں کا
ایک دُھندلا سا آئنہ تھامے
اپنی پرچھائیوں کو حسرت سے
دیکھتا جائے — سوچتا جائے
گال میرے کبھی گلاب سے تھے

خزاں کے بعد بہار آئے گی۔ لیکن ہمارے اس دوست کے گال شاید پھر کبھی گلاب نہ بن سکیں۔ اور اس نظم میں دُکھ کا پہلو بھی یہی ہے۔

یہاں آپ کو ہم آدھی رات کے شاعر ہشو چہ مو کی زبانی ایک اور نظم سناتے ہیں۔ یہاں اُس کی ہیروئن آدھی رات کو لمپ کی مدھم روشنیوں کے حلقے میں سسکیاں بھرنے والی کوئی نامعلوم عورت نہیں ہے۔ ایک بیل ہے۔ جو بہت دنوں اپنے رنگ کو برقرار رکھتی ہے۔ خزاں کی آمد۔ اسکے گداز سبز رنگ پر پیلے دھبے ڈال جاتی ہے۔ لیکن وہ ہمت کر کے دیوار سے چمٹی رہتی ہے۔

کس قدر سرد ہے خزاں کی ہوا
پیلے پیلے اداس سے پتّے
میرے آنگن میں پھڑپھڑاتے ہیں —
جیسے اُجلی فضاؤں کے پنچھی
ایک ان دیکھے تیر کے گھائل

— ننگی دھرتی پہ لوٹ جاتے ہیں
حسن فانی ہے، رنگ فانی ہے
زندگی کی امنگ فانی ہے

ایک دیوار پر سجیلی بیل
رنگ اپنا نبھائے جاتی ہے
— چند پیلے سے داغ دل پہ لئے
جب ہوا کے تھپیڑے کھاتی ہے
سسکیاں بھر کے رو ئی جاتی ہے
— کوئی ایسے میں اس کی بات سُنے
"زندگی سے گزر رہی ہوں میں
دکھ تمہارا ہی بھر رہی ہوں میں"

ہائے میرے لئے سجیلی بیل
اسقدر دکھ اٹھا رہی ہے کیوں
— کتنی بے درد ہے خزاں کی ہوا
جب چلے یہ — تباہیاں لائے
کس طرح آخری سنبھالے تک
— اس سے دبتا ہے زندگی کا دیا
"لو خزاں موت بن کے آ بھی گئی
بیل اس کا فریب کھا بھی گئی"

یہاں اس بیل کی داستان ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اس کے پتے سرد مٹی میں دفن ہونے اور گلنے سڑنے کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ اور یہ پتے بھی شاعر کو ایک ان دیکھے تیر کے گھائل پنچھیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ بیل کی پامردی سے یہ اُمید بندھتی تھی کہ خزاں شاید موت نہ بنے۔ لیکن شاید حقیقت کو شاعر پہلے ہی متعین کر چکا ہے۔ حسن فانی ہے۔ رنگ فانی ہے۔ اسلئے بیل کی موت بھی قدرتی ہے۔ اور ہم اور پیچھے پلٹ جائیں تو پائیں چہ لن کے اُس بہار کی زندگی بھی خزاں کی حدود سے شاید آگے نہ بڑھ سکے گی۔ جو ایک دھندلے آئینے میں اپنی پرچھائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ماضی کے دنوں میں بہت دور جا کر اپنے گلاب ایسے عارضوں کو اپنی حسرتوں کا مرکز بناتا ہے۔ لیکن یہاں اگر بیل کی داستان ختم ہو گئی ہے۔ شاعر کی داستان تو ختم نہیں ہو گئی۔ اسکے ساتھ ابھی کچھ دُور اور جانا ہوگا۔

تین تارے اب آسمانوں سے
میرے آنگن کو تک رہے ہیں خموش
— کس قدر مضمحل ہے آج کی رات

سسکیاں ہیں نہ کوئی نالہ ہے

ہر طرف ہے اتھاہ خاموشی

— میں ہوں اور میرا دل ہے آج کی رات

پیلے پیلے اُداس سے پتے

سرد مٹی میں دفن ہو بھی چلے

جانے کس کی جدائی میں بیٹھا

وقفِ حرماں و رنج و یاس ہوں میں

آج تنہا ہوں میں — اُداس ہوں میں

یہاں آکے تو معلوم ہوتا ہے کہ نظم کا مرکزی کردار بیل نہیں تھی۔ کوئی اور ہستی تھی اور بیل کے منہ سے جو باتیں کہلوائی گئی ہیں۔ وہ کسی اور کی باتیں ہیں — لیکن بیل دیوار سے گر گئی ہے۔ اور اس کے پتے بھی مٹی میں دفن ہونے لگے ہیں — کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے اس دوست کی محبوبہ بھی کسی قبرستان میں سرفشاں خاک کا جزو بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن آخری مصرع میں جس انداز میں تنہائی کا ذکر ہے۔ وہ انداز محض مہجوری کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں شاعر ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ چُپ ہی رہتا ہے۔ اپنا راز وہ کیوں رسوا کرے۔ مجھے اور آپ کو اپنی روداد کیوں سنائے۔ کیا ہمارے لئے بیل کی داستاں کافی نہیں — یہ بھی چیکیانگ ہی کی پت جھڑ کی رُت تھی۔

یہ ساری نظمیں آج کی نظمیں تھیں۔ یہ سارے شاعر آج کے شاعر تھے۔ جو چین کے مختلف اطراف سے خزاں کے تحفے لے کے آئے تھے۔ اب آخر میں ہم آپ کو ماضی میں بہت دُور آج سے کوئی دو ہزار سال پیچھے لے جاتے ہیں۔ جہاں ہان خاندان کا چھٹا شہنشاہ وُوتی ایک سرکاری دورے پر روانہ ہو رہا ہے۔ اسے مجبوراً اپنی محبوب بیوی کو پیچھے چھوڑ کر جانا ہے۔ یہاں نوجوان شاعر شہنشاہ اپنے بجرے میں اپنے ہمسفر ندیموں کے درمیان بیٹھا ہے۔

(یہ ترجمہ بھی نثر میں ہے)

خزاں کی ہوا زور باندھ رہی ہے۔ سفید بادل اُڑتے پھرتے ہیں۔

گھاس اور درخت مرجھا رہے ہیں — بطخیں جنوب کو روانہ ہو رہی ہیں۔

جنگلی بوٹیاں جاگ رہی ہیں۔ گل داؤدی سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے

مجھے اپنی محبوبہ کی یاد ستا رہی ہے

میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا

تیرتا ہوا گھوڑا (کشتی)، دریائے فین کو پار کر رہا ہے۔

ندی کے بہاؤ میں سفید لہریں بلند ہو رہی ہیں۔

بنسریاں اور تاشے کشتی بانوں کے گیت سے ہم آہنگ ہو کر بج رہے ہیں۔

عیش و طرب کی محفل گرم ہے

لیکن دل میں اداس خیالات آ رہے ہیں

جوانی کے ایام کتنے مختصر ہیں

بڑھاپا کیسی اٹل چیز ہے۔

اب آپ تانگ خاندان کے دورِ حکومت کی کچھ نظمیں خزاں کے بارے میں سنئے۔ یہ خاندان ۶۱۸ء سے ۹۰۷ عیسوی تک برسرِ اقتدار رہا ہے اور تانگ خاندان کی شاعری کے لئے چینی ادب میں ایک علیحدہ دور متعین ہے۔

وانگ وی کی نظم ایک پہاڑی جھونپڑی میں خزاں کی آمد کے موضوع پر ہے۔

خالی پہاڑی پر تازہ بارشیں ہوئی ہیں
خزاں شام کے جھٹ پٹے سے نکل کر آ رہی ہے۔
صنوبروں کے درمیان تابناک چاند چمک رہا ہے
شفاف ندی پہاڑیوں پر بہتی جا رہی ہے
بانسوں کے جھرمٹ میں بیل پرندہ اعلان کرتا ہے۔ کہ دوشیزائیں نہا کر گھروں کو واپس جا رہی ہیں۔
مچھیرے کی کشتی کے نیچے کنول جھوم رہے ہیں۔
بہار کی خوشبو لیے سانس بھرتی ہوئی رخصت ہوجاتی ہے۔
ہم اسے کیسے روک سکتے ہیں؟

اسی دور کا دوسرا شاعر مینگ ہاؤ جان گھر سے دور پردیس میں ابتدائے خزاں کی سردی کے بارے میں نظم لکھتا ہے۔ نظم کا عنوان یہی ہے۔ لیکن اصل میں یہ اپنے گھر سے دور ہونے کے احساس کی ایک داستان ہے۔ اس کا گھر سیانگ یانگ (ہنان) میں واقع ہے۔ اور خود وہ جھیل تنگ تنگ کے جنوب میں چیؤ میں کھڑا ہے۔

درخت پتوں سے خالی ہیں۔ جنگلی بطخیں جنوب کو پرواز کر گئی ہیں۔
دریا پر شمال سے جو ہوا آ رہی ہے۔ کتنی ٹھنڈی ہے۔
میرا گھر سیانگ یانگ کے لہریلے پانیوں کے پاس واقع ہے۔
چیؤ کے بادلوں سے بہت دور۔
میں اجنبیوں کے دیس میں گھر کی یاد میں بہت آنسو بہا چکا ہوں
اُفق پر مجھے ایک بادبان نظر آ رہا ہے۔ کاش میں اُسکے پیچھے پیچھے جا سکوں
میں گھاٹ پر حیران کھڑا ہوں۔ اور راستہ پوچھنا چاہتا ہوں۔
لیکن میرے سامنے پانی ہی پانی ہے۔ اور رات بڑھی آ رہی ہے۔

رات کا جھٹ پٹا بڑھا آ رہا ہے۔ اور بادبان پانیوں میں حدِ نظر پر جا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے شاعر کو اجنبیوں کے دیس میں آنسو بہانے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ بادبان کب آئے گا۔ جس کے سائے میں ہمارا دوست ہنان کے لہریلے پانیوں کے کنارے اپنے گھر پہنچ سکے گا۔
اب آپ اس دور کے مشہور ترین اور شاید بہترین شاعر لی پو کی زبانی غمِ ہجراں کی ماری ایک عورت کی کہانی سنئے۔ جس کا محبوب شمالی مغربی پہاڑیوں کی جانب تاتاریوں سے لڑنے کے لئے گیا ہے۔ لی پو کا زمانہ ۷۵۰ عیسوی کے گرد و پیش کا ہے۔ اور ذیل کے اشعار اُس کے چار موسموں کے گیتوں میں سے لئے گئے ہیں۔ یہ حصہ خزاں کے بارے میں ہے۔ اور سب سے خوب حصہ ہے۔ چانگ آن اُس زمانے کی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔

چانگ آن میں چاند ایک پتلی قاش کی صورت میں چمک رہا ہے
ہزاروں گھروں سے کپڑوں کے کوٹنے کی آوازیں آرہی ہیں۔
شمال مغربی پہاڑیوں کے درے سے
خزاں کی ہوا مسلسل چلے جارہی ہے۔
ہائے۔ ان تاتاریوں کو کب شکست ہوگی۔
میرا محبوب دور دراز کے میدانِ جنگ سے کب لوٹے گا۔

اس دور کی قریب قریب ساری نظمیں ہجر طویل، جنگ کے خطرات اور دربار سے معتوب ہوکر دور دراز مقامات پر بھیجے جانے کے خدشے کے بارے میں ہیں۔ یہ اُن دنوں کی حکومتوں کی ناپائداری اور کمزوری کی داستانیں ہیں۔ ان میں کوئی پیغام نہیں ہے۔ کوئی سیاسی بیداری نہیں ہے۔ یہ ادھیڑ عمر کی شاعری ہے۔ جوانی کی شاعری نہیں ہے۔ خزاں کی شاعری ہے۔ بہار کی نہیں ہے۔ بلکہ چینی ادب میں اس دور کی قدر ہی آج کل اس کے خزاں سے متعلقہ موضوعات کی وجہ سے ہے۔

چنانچہ لی پو کی نظم کی محبوبہ بھی ایک غیر یقینی امید میں انتظار کر رہی ہے۔ کہ اس کا محبوب تاتاریوں کو شکست دے کر کب گھر لوٹے گا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب تاتاری سیلاب صفت ہر سمت حملے کر رہے تھے اور آگے بڑھتے آتے تھے۔ چنانچہ شمالی مغربی پہاڑیوں کا درہ ہمیں اس دور کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔ اب معلوم نہیں اس نظم کا محبوب تاتاریوں کو شکست دے کر واپس آئے گا یا شمال مغربی سرد ہوائیں کھردری پہاڑیوں پر ایک غریب الوطن سپاہی کی موت کی خبر لے کر آئیں گی۔

عبد اللہ ملک

کون جیتا ہے، کون مرتا ہے

یہ موسم سرما کا ذکر ہے۔ یورپ میں موسم سرما موت کی وحشت اور ہو کا عالم اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ درختوں کی شاخوں سے پتیاں جھڑ جاتی ہیں ہریالی غائب ہو جاتی ہے، پھولوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ سبزہ دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں، اور ایسے سمے میں خاموش اور طویل راتیں کاٹنے کو دوڑتی ہیں، اسی لئے دیر دیر تک کیفے اور ریستوران کھلے رہتے ہیں ننگے بازوؤں اور اُبھری ہوئی چھاتیوں والی دوشیزائیں اور فرانسیسی شراب کے چٹخارے ہی ان طویل اور مسلسل راتوں میں مونس و غم خوار کا کام دیتے ہیں۔

اور پیرس میں تو یہ طویل راتیں بلا کی حسین ہوتی ہیں، پیرس میں تو ایسے موسم میں ابر آلود اور مختصر دن کو نہیں بلکہ رات کو زندگی حرکت کرتی ہے۔ اس کے کیفے اور ریستورانوں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، اور شراب کے نشے اور بدمست دوشیزاؤں کی گرمی کی وجہ سے سردی کی یخ بستگی بھول جاتی ہے۔

لیکن جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان دنوں کا پیرس بالکل خاموش تھا، اس پر موت کی مردنی چھائی ہوئی تھی، اس کے باغ اور پارکیں، اس کے گرجے اور تاریخی عمارتیں سبھی موت کے کہر میں چھپی ہوئی تھیں۔ ان دنوں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نوترے دیم کے دو بڑے بڑے چوکور میناروں پر شیاطین کے جو مجسمے نصب ہیں، وہ صرف نیچے چلنے والوں انسانوں کا مذاق ہی نہیں اڑا رہے ہیں بلکہ انہیں موت کی اندوہناک خبر بھی سنا رہے ہیں۔ ان دنوں لوورے کے سائے میں، یا لوئی مری کے باغ میں یا سین کے کنارے کسی جگہ بھی فرانس کے خوبصورت اور حسین جوڑے گھومتے نظر نہیں آتے تھے بلکہ صرف نازی سپاہی سیٹیاں بجاتے، پیرس کی حسین اور نڈھال عورتوں کو زبردستی اپنے پہلو میں دبائے گھومتے نظر آتے تھے۔

یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے، فرانس شکست کھا چکا تھا۔ اس کا پرچم سرنگوں تھا، اور اس کا دارالسلطنت پیرس —— وہی پیرس جسے فرانس والے شہروں کی ملکہ کہتے تھے، جس میں یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے مجسمے نصب تھے جس کے درمیان سے دریائے سین بل کھا کر گزرتا تھا، یہ حسین و جمیل پیرس ایک نڈھال اور بے جان عورت کی طرح ہٹلر کے قدموں پر پڑا سسک رہا تھا، یہ وہی پیرس تھا جس کے گلی کوچوں سے ڈیڑھ سو برس پہلے حریت، اخوت، اور مساوات کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے تھے۔ اور آن کی آن میں پوری دنیا ایک زبردست جمہوری انقلاب کے لپیٹ میں آگئی تھی، اسی پیرس میں ایک مطلق العنان بادشاہ، اس کی ملکہ اور اس کے ای موالی امیروں کے سر قلم کر دیئے گئے تھے۔ بیرونی فوجوں اور شہنشاہوں نے اس انقلابی فرانس پر لشکر کشی کی لیکن فرانس کے چوڑے سینے اور کشادہ پیشانی والے انسانوں نے توپوں کے سامنے اپنے سینے پیش کر دیئے اور بالآخر ان شہنشاہوں کو بھاگنا پڑا۔ فرانس کا انقلاب کامیاب ہو گیا، نیلے، سفید اور سرخ رنگ کا پرچم سربلند رہا۔ اور پیرس میں فرانسیسی سپوت بلند آواز سے گاتے رہے۔

فرزندانِ وطن اٹھو اور چلو
تمہاری سرخروئی کا دن آ پہنچا
ہمارے خلاف ظلم نے اپنا خونی پرچم اٹھایا ہے۔

ہمارے ننھے ننھے بچوں اور حسین دوستوں

کو ذبح کرنے کے لئے

——— فرزندانِ وطن، اٹھو اور چلو

تم بھی صف بستہ ہو جاؤ، تلواریں کھینچ لو،

شہر کی نالیوں میں ان ناپاک انسانوں اور ظالموں کا خون بہا دو،

فرزندانِ وطن، اٹھو اور چلو،

پیرس کی صاف اور کشادہ سڑکوں پر انسانوں کے دل کے دل یہ گیت گاتے ہوئے گذرتے تھے، اس گیت سے پوری دنیا لرزہ بر اندام تھی۔ یہ انقلابیوں کا گیت تھا، یہ فرانس کے باشندوں کا گیت تھا، یہ پیرس کے حسینوں کا نغمہ تھا۔ یہ پہلا انقلاب تھا جس نے جاگیر شاہی کو ختم کر ڈالا، ایک نیا نظام وجود میں آیا جس نے انسانوں کو زمیندار کی غلامی سے نکال کر آزادانہ طور پر کارخانہ دار کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ اور مزدوروں کی ایک لاتعداد فوج کو جنم دیا۔

اور پھر اسی پیرس میں، اسی انقلاب فرانس کے پیرس میں، پہلی بار مزدوروں نے مشینوں پر کام کرنے والے، ریلوں میں کوئلہ جھونکنے والے، کانوں سے فولاد اور کوئلہ نکالنے والے، توپ اور بندوق ڈھالنے والے محنت کشوں نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا، یہ ۱۸۷۰ء کا واقعہ ہے، جرمن فوجیں پیرس کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں، سرمایہ پرست فرانسیسی سیاست دان دشمنوں سے شرمناک شرائط پر سمجھوتہ کرنے کے لئے آمادہ تھے لیکن پیرس کے پھٹے کپڑے اور چوڑے سینے والے محنت کشوں کو یہ شکست منظور نہ تھی، ان محنت کشوں نے اپنا سرخ پرچم بلند کیا، اور اسی حسین و جمیل پیرس میں ۷۰ گھنٹے تک پہلا اشتراکی نظام قائم کیا، اور یہی وہ ۷۰ گھنٹے کا خون آشام تجربہ تھا جو ۱۹۱۷ء تک دنیا بھر کے محنت کشوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا۔

یہ پیرس، یہ انقلابِ فرانس کا پیرس، یہ ۱۸۷۰ء کی کمیون کا پیرس، یہ حسین و جمیل پیرس ۱۹۴۱ء کے زمانے میں فاشسٹوں کے قبضے میں تھا، اس پر جرمن پرچم لہرا رہا تھا، اس پر وہ پرچم لہرا رہا تھا، جو انقلاب کا سب سے زبردست دشمن تھا، اس پیرس پر جہاں سے علم و فن کے چشمے اُبلتے تھے سب سے زیادہ علم دشمن طاقت کا قبضہ تھا، اس فرانس پر جس کی زبان کی شیرینی اور مٹھاس ٹ، کی کرختگی تک برداشت نہ کر سکتی تھی۔ آج اس پر نازی درندوں کی حکومت تھی،

فرانس کے سرمایہ دار راہنماؤں نے جرمن سرمایہ داروں کے ہاتھ اپنے ملک کو بیچ دیا، تاکہ ان کا منافع باقی رہے، اس طرح سے دو سرمایہ داروں نے اپنے ملک کے عوام کے خلاف سرگوشی کی اور پتیان، لیول جیسے قائدین نے اپنے ملک کو، اپنے فرانس کو، شہروں کی ملکہ پیرس کو، فروخت کر ڈالا ——— قومے فروختند چہ ارزاں فروختند۔

اسی پیرس میں ۱۹۴۱ء کے سال جب جاڑے کا موسم اپنے پورے جوبن پر تھا، تو پیرس کے ایک جیل میں علی الصبح جب ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی، اور پورے پیرس پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی تو ایسے وقت میں چھ گولیوں کی سنسناہٹ نے خاموشی کو توڑ دیا۔ اور گبریل پیری دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

گبریل پیری جس کی جوانی ابھی ڈھلی نہ تھی، اس کی عمر صرف ۳۹ برس تھی، جو پیرس کی طرح حسین تھا اور پیرس کے باغوں اور پارکوں کی طرح نفاست پسند، اس کی تقریر اور تحریر بھی اس کی اپنی طرح حسین اور نفیس ہوتی تھی، اور پندرہ دسمبر ۱۹۴۱ء کی ایک صبح کو یہ حسین اور نفیس ادیب صحافی اور فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک رکن پیرس کی ایک جیل میں پو پھٹنے سے بھی پہلے نازیوں کی گولی کا نشانہ بن گیا، اس لئے

کہ نازی یہ سمجھتے تھے کہ گبریل کو موت دے کر وہ فرانس کو بھی موت دے سکتے ہیں، لیکن نازیوں کی گولیوں کی سنسناہٹ میں بھی اس کے لبوں پر بلا کی مسکراہٹ تھی، اور وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر انٹرنیشنل گنگنا رہا تھا، اور بہت دفعہ تو پیری کی آواز کی گونج گولیوں کی سنسناہٹ پر بازی لے جاتی، اور ساتھ کی بارکوں سے یہ مزدور کا بین الاقوامی ترانہ گونج اٹھتا، یہ جواب تھا پیری کو موت دینے والوں کو کہ فرانس زندہ رہے گا، مزدور طبقہ زندہ رہے گا اور پھر آواز بلند ہوتی گئی۔

اُٹھو، اے دنیا کے مظلومو، اٹھو،
غربت کے زندانیو، اُٹھو،
عقل نے بغاوت کا پرچم کھول دیا ہے،
خرد گرج رہی ہے
آخری دور کی جوالا پھوٹ رہی ہے،
آؤ ماضی کا قصہ پاک کر دیں،
غلامی کی مصیبتیں جھیلنے والو!
قدم بڑھاؤ، صف بستہ ہو جاؤ۔
دنیا کی بنیادیں بدل رہی ہیں،
آج تک ہم کچھ بھی نہ تھے،
آؤ اب سب کچھ ہو جائیں،
یہ آخری لڑائی ہے،
قدم بڑھاؤ، متحد ہو جاؤ،
اور کل اس دنیا کے رنگ دبو پر
مزدوروں کی بین الاقوامی برادری کا راج ہو گا۔

یہ ترانہ گونجتا رہا لیکن پیری کی سانس اکھڑ گئی، اس نے جیل میں نازیوں کی پوری نگرانی اور گسٹاپو کی پوری چالاکی کے باوجود، کچھ خطوط اور اپنی مختصر سی سوانح لکھی، اور اس نے نہایت ہوشیاری سے ان چیزوں کو باہر اپنے دوستوں کے پاس پہنچا دیا، پیری کی خود نوشتہ سوانح کوئی زیادہ طویل شے نہیں اور لطف یہ ہے کہ ان صفحات میں کہیں بھی موت کا سایہ نہیں پڑا، اس نے نہایت سادگی اور متانت سے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو قلمبند کیا ہے اس نے بتایا ہے کہ وہ کس طرح سے جذباتی لگاؤ سے نہیں بلکہ علم و عقل کی راہ سے انقلاب کی طرف آیا ہے۔

پیری کی یہ سوانح سب سے پہلے اس وقت چھپی تھی، جب کہ فرانس ابھی غلام تھا، جبکہ پیرس پر ابھی نازی دندنا رہے تھے۔ اور یہ اوراق فرانسیسی مجاہدین نے خفیہ طور پر چھاپے تھے، اس سوانح نے فرانسیسی محبانِ وطن میں آگ لگا دی تھی، اور اس کے بعد ہر دن اور رات سینکڑوں ہزاروں نازی مرے پائے جاتے، ان کی جیبوں سے، ان کے سینوں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکلتا "پیری کے قاتلو تم زندہ نہیں رہ سکتے، فرانس تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا"

پیری ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا، اس کو تعلیم، اور تعلیم کے بعد ملازمت میں قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، وہ ابھی ۲ برس کا ہی تھا کہ وہ ملازم ہو گیا اور ملازمت کا معاوضہ بہت اچھا خاصا ملنے لگا۔

چنانچہ وہ خود لکھتا ہے

"۱۹۱۹ء کا ذکر ہے ۱۹۱۸ء کے بعد سماجی مسائل نے مجھے بیحد پریشان کرنا شروع کر دیا، اور سوشلزم کی طرف میں مائل ہوتا چلا جا رہا تھا، لیکن سوشلزم سے میرا لگاؤ کوئی معاشی ناہمواری اور سماجی ناانصافی کی وجہ سے نہیں ہوا اور نہ ہی خاندانی تربیت اور دوستوں کی صحبت نے مجھے سوشلزم کی طرف مائل ہونے میں مدد دی۔

بلکہ —— میں ذہنی طور پر اس وقت سنِ بلوغ کو پہنچا جبکہ دنیا میں سب سے بڑی حقیقت جنگ تھی، جنگ ایک ایسی حقیقت تھی جس سے گریز محال تھا، زندگی کے ہر موڑ پر اس تلخ حقیقت سے آمنا سامنا ہوتا تھا۔ اور اسی ٹھوس اور تلخ حقیقت نے میرا اندازِ فکر بدل دیا۔ میں یہ جانتا تھا کہ فرانس کی سرکار اور اس کے حالی موالی فلسفی اور ادیب جنگ کی جو تشریح کرتے ہیں وہ غلط ہے اور اس کی حقیقت ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں، مجھے جنگ کی سماجی تشریح اور وجہ کی تلاش تھی، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ جنگ کیوں ہوتی ہے، کونسی طاقتیں اس میں کام کرتی ہیں؟ اور کیا یہ لاکھوں، کروڑوں انسانوں کا قتلِ عام کبھی ختم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مجھے ان سوالوں اور اس کے علاوہ دوسرے سماجی مسائل کے حل کی تلاش تھی، اس دور میں مجھے یہ جوابات کہ جنگ کی وجہ انسانی حسد، رقابت، نسلی برتری کا جذبہ وغیرہ وغیرہ ہیں تشفی کرنے میں ناکام رہے تھے"

یہی سوال تھے جن کی تلاش میں پیری کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ ذہنی آسودگی چاہتا تھا لیکن ایک جنگ زدہ جہان میں آسودگی کہاں میسر آ سکتی ہے، اور شاید یہی بے تابی تھی جس نے پڑھنے کی طرف مائل کر دیا اور سکول میں بھی "ذہین طلبا" میں شمار ہونے لگا۔ سکول کے دوران میں اس نے مختلف فلسفوں کے بارے میں پڑھتے ہوئے چند سطریں "تاریخی مادیت" کے متعلق پڑھی تھیں، ان چند سطروں نے اس کی جستجو کو اور بڑھایا، چنانچہ پیری لکھتا ہے۔

"تب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تاریخی مادیت کو مارکس نے "کمیونسٹ مینی فسٹو" میں دنیا کی تاریخ اور حالات پر منطبق کیا ہے۔ تو میں نے کمیونسٹ مینی فسٹو اور کیپٹل کی شرح پڑھ ڈالی، لیکن ان بے پناہ مسائل کا جواب صرف ان چیزوں سے میسر نہیں آتا تھا، چنانچہ میں نے مارکس اور اینگلز کی ہر کتاب بلا کسی ترتیب کے پڑھ ڈالی، اب صرف میرے سامنے جنگ اور اس کی تلخیاں ہی نہ تھیں، بلکہ پورا نظامِ حیات ایک آزمائشی دور میں سے گذر رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دنیا کے نقاد اس کو ختم کر دیں گے۔ اب میں اس دنیا کے بارے میں پوری طرح واقف ہو چکا تھا، میں یہ سمجھ چکا تھا کہ اس نظام نے ایسے ہتھیاروں کو جنم دیا ہے جو خود اس نظام کو موت کی نیند سلا دیں گے، اور اسی نظام نے ایسے انسانوں کو بھی جنم دیا ہے جو ان ہتھیاروں کو ایک دوسرے سے مل کر استعمال کریں گے، اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سوشلزم دوسری تحریکوں کی طرح تحریک نہ تھی۔ بلکہ ایک نئے انسان کی تخلیق کی نوید تھی، لیکن سوشلزم اور اس نئے انسان کی تخلیق کے لئے صرف ذہنی آسودگی اور فکری پختگی کافی نہیں بلکہ عمل بھی ضروری ہے، اور اس نئے انسان کی تخلیق میں علم و عمل کی علیحدگی غداری ہے۔

جو واقعات اس وقت رونما ہو رہے تھے انہوں نے مجھے بالکل ہلا ڈالا، اور میرے فکر کو بالکل ہی بدل دیا، روسی انقلاب نے تو بالکل ایک اچھوتے سوال کا جواب پیش کر دیا، کہ کیا سوشلزم عمل کی کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے؟

اس وقت تک میں بھی سوچا کرتا تھا کہ کوئی اچھا سا پیشہ اختیار کروں گا خوبصورت سی لڑکی سے بیاہ رچاؤں گا ننھے ننھے بچے، گھریلو زندگی ایک چھوٹا سا گھر اور پڑھنے لکھنے کا شغل جاری رکھوں گا، اور اس طرح سے نجی اور گھریلو آسودگی کے ساتھ ذہنی آسودگی حاصل کر کے سوشلزم کے لئے علمی کام کروں گا۔

لیکن ۱۹۱۸ - ۱۹۲۰ء کے دوران میں جو حادثات رونما ہوئے، انہوں نے ثابت کر دیا، کہ انقلاب کے لئے علم نہیں عمل کی ضرورت ہے، اور اس کے لئے وقت کا حصّہ درکار نہیں زندگی درکار ہوتی ہے۔

انقلاب کو اگر اولیت حاصل ہے تو پھر دوسری تمام چیزیں ثانوی درجہ رکھتی ہیں، پھر کسی کاروبار یا پیشہ کا فیصلہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کونسا کام میرے انقلابی کام میں رکاوٹ اور کونسا ممد ہے۔ اور یہی فیصلہ کن چیز ہوگی۔

یہ آج سے بیس برس پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا، اور اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں میں نے آنکھوں میں کاٹی تھیں، کون کون سی راحتوں کو میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا، کن کن آزمائشوں کے لئے میں نے خود کو تیار کیا تھا، اور کتنی پیاری اور دلفریب یادوں کو میں نے اپنے دل کے ویران گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفنا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود میں نے خارزار چن لیا، یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہ تھا، نہ کسی خاص موڈ کا نتیجہ تھا۔

جس زمانے میں میں تھا، اس زمانے کے حادثات نے ہماری پوری پود کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ ان حادثات سے بے نیاز رہنا ناممکن تھا! اس لئے ہم کشاں کشاں انقلابی محاذ میں داخل ہوتے گئے، یہ بغاوت کا اعلان تھا، سرمایہ داری نظام اور قانون کے خلاف، سرمایہ داری اخلاق کے خلاف، ہم جنگ سے نفرت کرتے تھے ہمیں جنگ کے دوران میں منافع کمانے والے اور چور بازار کے تاجروں سے گھن آتی تھی، ہمیں سرمایہ داروں کے خوش پوش لڑکوں تک سے نفرت تھی۔ سرمایہ داروں کی شادیوں کو ہم تعیش کا سامان سمجھتے تھے، انقلاب سے مراد ذہنی آزادی اور عوام کے ذوق کی بلندی تھی۔

میں اس راہ سے انقلاب کی طرف آیا ہوں، میں نے اس منزل تک پہنچنے کے لئے بے پناہ پڑھا اور فکر کیا ہے، چنانچہ جب ۱۹۱۹ء کے یوم مئی میں شریک ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں انقلاب کے دھارے پر کھڑا ہوں، چنانچہ اسی سال میں سوشلسٹ پارٹی کا رکن بن گیا۔ اور اگلے سال جب کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شرکت کا سوال اٹھا تو میں سوشلسٹ پارٹی کے بائیں بازو میں سے تھا، جو کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شرکت کے حامی تھے، چنانچہ اگلے سال فرانس کی کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی میں اس میں شریک تھا۔"

پیری کی یہ ابتدا تھی، بیس برس وہ انقلاب کے لئے، فرانس کے لئے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے خلاف برسر پیکار رہا، پیری کی زندگی پورے فرانس کی زندگی ہے، وہ بلاشبہ ایک بے داغ کمیونسٹ تھا۔ اور اسی کمیونزم کے لئے اس نے زندگی جیسی متاعِ عزیز بھی قربان کر دی۔

پیرس کی ایک جیل میں وہ رات کے آخری حصّے میں بیٹھا چند سطریں لکھ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ پو پھٹنے سے پہلے ہی اسے نازی سپاہیوں کی گولیوں کا مقابلہ کرنا ہے، وہ پوری رات بیس برس کی زندگی پر غور کرتا رہا وہ موت کے منہ میں اپنی زندگی، اپنے مقاصد، اپنے نصب العین کا امتحان لے رہا تھا، چنانچہ اس نے اسی رات اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا:

"میرے دوستوں سے کہہ دینا کہ میں نے آخر دم تک اپنی زندگی کے مقاصد اور نصب العین سے منہ نہیں موڑا ہے، میرے ہم وطنوں کو سلام پہنچانا اور کہنا کہ میں اس لئے مر رہا ہوں تاکہ فرانس زندہ رہے۔

میں نے آخری بار اپنے ضمیر کو ٹٹولا ہے، اور جواب مثبت میں ہے، اگر مجھے زندگی ایک بار پھر سے شروع کرنی پڑے تو میں یہی راہ اختیار کروں گا۔ آج رات میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دوست کوتیر کس قدر صحیح کہا کرتا تھا کہ کمیونزم زندگی کا شباب ہے، اور یہ انسان کو مستقبل کے نغمے گانے کے لئے تیار کرتا ہے، تھوڑی دیر بعد میں مستقبل کا نغمہ گانے والا ہوں۔ میں موت کے قریب سے قریب تر ہو رہا ہوں، اور میں اس سے بھی اپنے آپ کو مضبوط محسوس کرتا ہوں، میں موت کے منہ میں بھی مسکرا رہا ہوں،

فرانس زندہ باد"

(بقیہ بر صفحہ ۵۸)

باری

ہیروڈوٹس کی تاریخ نگاری

ہیروڈوٹس ۴۸۴ ق م کے لگ بھگ ایشیائے کوچک کی ایک یونانی نوآبادی ہیلی کارناسوس میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم کا اندازہ اس کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی تحریروں پر ہومر کا بہت زیادہ اثر ہے۔ چونکہ ہیلی کارناسوس کی یونانی نوآبادی پر ایران کا قبضہ تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسے ایران کے بارے میں ایرانیوں نے بھی معلومات بہم پہنچائی ہوں۔ ہومر کے علاوہ وہ کئی ایک دوسرے یونانی شاعروں کا بھی حوالہ دیتا ہے جس سے اس کی تعلیم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اسکے دور کی مشکلات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ تو یہ ماننا پڑیگا۔ کہ اس نے طویل سفر کر کے ذریعے اپنی معلومات بڑھائیں۔ وہ جس ملک میں جاتا ہے۔ وہاں کے طبیعی حالات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ اس ملک کے رسم و رواج اور وہاں کی عبادت گاہوں سے بھی واقفیت حاصل کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم گزرے ہیں۔ جنہوں نے معلومات کے لئے طویل سفروں کی اتنی مصیبتیں جھیلی ہوں۔ جتنی "بابائے تاریخ" نے جھیلیں۔

سینتیس برس کی عمر میں ہیروڈوٹس اپنے آبائی شہر ہیلی کارناسو کو چھوڑ کر ایتھنز میں آباد ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک وہ اپنی "تاریخ" کے بہت سے حصے لکھ چکا تھا۔ اگلے سال ایتھنز کی اسمبلی نے اسے انعام دیا۔ ایتھنز کے دورانِ قیام میں اسے اس شہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ ہیروڈوٹس ایک اجنبی تھا۔ اسلئے وہ ایتھنز میں شہری حقوق حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ چار سال کے بعد وہ اٹلی چلا گیا۔ تھوری ام کی اس یونانی نوآبادی میں ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب کو دہرایا اور اس میں جگہ جگہ اضافہ کیا۔ جارج رالنسن اس امر کی تائید کرتا ہے کہ ہیروڈوٹس نے تھوری ام میں "اشوریا کی تاریخ" بھی لکھی تھی۔ تھوری ام میں رہائش اختیار کرنے کے بعد ہیروڈوٹس ایک مرتبہ ایتھنز گیا۔ ایتھنز سے واپسی کے تھوڑی مدت بعد اس نے ۴۲۴ ق م میں تھوری ام میں انتقال کیا۔

کیا ہیروڈوٹس اپنی "تاریخ" کے لئے ان تمام ذرائع کو استعمال میں لاتا ہے۔ جو اس وقت میسر آ سکتے تھے۔ کیا وہ اس تاریخی مواد سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو اس وقت یونانی زبان میں موجود تھا۔ بلاشبہ وہ ذاتی مشاہدے اور تحقیق سے کام لیتا ہے۔ اور غیر یونانی باتوں کی تحقیق کے لئے لمبے سفر اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ لیکن کسی مورخ کے کارنامے کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اس عہد کے ذرائع کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے۔ کہ اس نے ان ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے۔

جارج رالنسن "ہیروڈوٹس کی تاریخ" میں ہیروڈوٹس کے ذرائع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے "یہ امر طے شدہ ہے کہ جب ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی۔ تو اس وقت اس کی اپنی زبان میں تاریخی معلومات کا کافی ذخیرہ تحریری صورت میں موجود تھا"۔ لیکن اس مصنف کا خیال ہے۔ کہ ہیروڈوٹس اس تاریخی مواد سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکا۔ کیونکہ اس زمانے میں اس قسم کی تحریریں مشکل ہی سے حاصل ہوتی تھیں۔ ہیروڈوٹس سے پہلے زین تھس، لیڈیا کی تاریخ لکھ چکا تھا۔ لیکن ہیروڈوٹس اپنی کتاب میں جہاں لیڈیا کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ وہاں وہ زین تھس کا کوئی حوالہ نہیں دیتا۔ ہیروڈوٹس کسی جگہ بھی دوسروں کا حوالہ دینے سے گریز نہیں کرتا۔ چونکہ لیڈیا کے باب میں وہ کہیں بھی زین تھس کا حوالہ نہیں دیتا۔ اسلئے اس امر کو ماننا پڑتا ہے کہ زین تھس کی تحریر اس کی رسائی سے باہر تھی۔ اسی طرح وہ دیونی سی اس اور چیرن کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیتا۔ ہیروڈوٹس کا یہ طرزِ عمل اس کی

تاریخ نگاری پر اسلئے زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ کیونکہ دیونی سی اس کے علاوہ ذینی مخس، چیرن اور دوسرے محرروں کے ذرائع کم وبیش وہی تھے۔ جو ہیروڈوٹس کو میسر تھے۔ ہیروڈوٹس اپنے عہد کے موجودہ تاریخی لٹریچر سے استفادہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے وہی ذرائع حاصل ہیں۔ جو اس سے پہلے کے بیشتر یونانیوں کو حاصل تھے۔ اسی طرح جغرافیائی معلومات کے ضمن میں وہ صرف ان مقامات کے متعلق دوسرے جغرافیہ نگاروں کی معلومات پیش کرتا ہے۔ جہاں وہ خود نہیں جاسکا۔

یونانیوں کے بارے میں ہیروڈوٹس کی معلومات کے وسائل وہی تھے۔ جو اس سے پہلے پیشرو یونانی مورخوں کو میسر تھے۔ وہ ان وسائل اور ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ اُن معلومات کو اچھی طرح سے پرکھتا ہے۔ جو اس تک زبانی پہنچائی گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہیروڈوٹس کے پیش نظر یونان پر ایرانی حملے کی تاریخ اور ایران و یونان کی آویزش کا تذکرہ مرتب کرنا ہے۔ لیکن وہ اس تذکرے ہی کو زیادہ موثر بنانے اور عمومی تاریخ کی کڑیاں ملانے کے لئے دوسرے ملکوں کی تاریخ بھی پیش کرتا ہے۔ وہ اس مواد سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو بابل، سوسہ، اکتبانہ، میمفس، ہیلیوپولس، اور تھیبہ کے معبدوں کے کتبوں کے علاوہ پروہتوں کی ان معلومات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو ان کے ذہنوں میں محفوظ تھیں۔ مصر کی تاریخ لکھتے وقت وہ اس امر کا اقرار کرتا ہے۔ کہ اس کی معلومات کے ذرائع مصری پروہت ہیں۔ ان پروہتوں نے اپنے وقار کو یونانی حلقوں میں قائم کرنے کے لئے ہمارے مورخ کو غلط اطلاعات پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے تذکرے میں ہیروڈوٹس بعض غلط واقعات بھی درج کر دیتا ہے۔ مصری پروہتوں کی غلط بیانی کے باوجود جہاں کہیں اسے شک ہوتا ہے۔ وہ کمزور روایت کو مسترد کر دیتا ہے۔ بابل کی تاریخ سے متعلق ہیروڈوٹس کی معلومات کا انحصار بالوس کے مندر کے پروہتوں کے علاوہ ان لوگوں پر بھی ہے۔ جن کا پیشہ اجنبیوں کو بابل کے پرانے آثار دکھانا ہوتا تھا۔

ہیروڈوٹس کے آبائی وطن پر چونکہ ایران کا قبضہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایشیائے کوچک کے بعض دوسرے بڑے شہر ایران ہی کے قبضے میں تھے۔ اس لئے ہیروڈوٹس ان شہروں میں مقیم ایرانی افسروں سے پرانے ایران کی تاریخ سے متعلق مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ نیز ہیروڈوٹس کے زمانے میں ایسے یونانیوں کی کمی نہیں تھی۔ جو ایران کی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ ان یونانیوں سے بھی اس نے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ایران کے بارے میں بھی چونکہ اس کا انحصار دوسروں پر تھا۔ اس لئے وہ ایران کے تذکرے میں بعض غلط روایات کو بھی قبول کر لیتا ہے۔

ہیروڈوٹس کے زمانے میں اور صدیوں بعد تک بھی یونانی غیر یونانی افراد اور اداروں کو بربری کہہ کر حقارت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہیروڈوٹس، جمہوریتوں کو مستبد حکومتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ ایتھنز سے محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ غیر یونانی افراد اور اداروں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ وہ اپنی "تاریخ" میں ایتھنز کے بہت سے اداروں پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے۔ "ایتھنز کے لوگوں کی اکثریت آزادی کی جگہ استبداد کو پسند کرتی ہے"، اس جملے کے لکھنے والے پر ایتھنز کی بیجا اور بے جا حمایت کرنے کا الزام لگانا زیادتی ہے۔ وہ یونانیوں کو دنیا کی سب سے زیادہ بہادر اور عاقل قوم بنا کر پیش نہیں کرتا۔ وہ ایرانیوں کی سادگی، شجاعت، صداقت پسندی اور وفاداری ہی کی تعریف نہیں کرتا۔ بلکہ وہ شخصی حکومت میں ڈھلے ہوئے ایرانی اداروں اور قوانین میں سے بھی بعض ایک کی تعریف کرتا ہے۔ وہ یونانیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست کا سبب بہادری کی کمی نہیں بتاتا۔ وہ ایرانیوں کی شکست کی ذمہ داری سامان حرب اور ضبط کی کمی پر ڈالتا ہے۔ ایران کے علاوہ وہ دوسرے ملکوں کا بھی غیر جانب داری سے مطالعہ کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے راسن لکھتا ہے کہ ہیروڈوٹس اصل بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کہ مصر اور فریقیہ بہت پرانے ملک ہیں، ہندوستانی اور تھریس بہت طاقتور ہیں، بابل کی زرخیزی کا کوئی جواب نہیں، سیتھیا غیر ملکی حملوں سے محفوظ ہے، مصر، بابل اور لیڈیا حیرت انگیز عمارتوں سے اٹے پڑے ہیں، ایتھوپیا میں حسین ترین اور زیادہ عمر پانے والے لوگ بستے ہیں، میڈیا کے گھوڑے نفیس ترین ہیں۔ عرب اور دنیا کی حدود پر واقع، دوسرے ملکوں میں عجیب و غریب اور نہایت عمدہ اشیا ملتی ہیں، ایران، بابل، مصر اور وینیشیا میں اچھے قوانین نافذ ہیں" وہ بابلیوں اور مصریوں کی ایجادات کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی تعصب کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ کہ یونانیوں نے دوسرے ملکوں سے کیا کچھ سیکھا ہے۔ وہ یہ بھی

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

کنھیا لال کپور

دانت نکلوانا

قارئین! معاف کیجئے۔ کہ دانت نکلوانے ایسے موضوع میں رومان کے لئے قطعاً کوئی جگہ نہیں۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ ہر چیز میں رومان تلاش کرنے کے عادی ہیں۔ مضمون کا عنوان "مزدور کی موت" یا "ادیب کی خودکشی" کیوں نہ ہو۔ مگر آپ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا مزدور نے مرنے سے پہلے کسی بھکارن سے عشق کیا۔ اور اگر ادیب نے خودکشی کی۔ تو کیا اسکی وجہ یہ تو نہیں تھی۔ کہ اُسے اپنے ہمسائے کی عورت سے محبت تھی۔ چنانچہ جب آپ کرشن چندر کا مضمون "مجھے کتے نے کاٹا" پڑھتے ہیں۔ تو آپ کی یقیناً یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ اس مضمون میں بھی افسانہ نویس کو رومان کے لئے کوئی نہ کوئی موقع ضرور ڈھونڈ لینا چاہیئے۔ اب کرشن چندر فطرتاً رومانی واقع ہوئے ہیں۔ اسلئے وہ آپ کو مایوس نہیں کرتے۔ اور جونہی ہسپتال میں ٹیکہ لگوانے کے لئے پہنچتے ہیں۔ وہاں کی چلبلی اور شوخ اینگلو انڈین نرس سے اُن کا رومان شروع ہو جاتا ہے۔ مگر کرشن چندر اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ وہ رومانی افسانہ نویس ہیں۔ اور رومانی افسانہ نویس کو رومان اس طرح بہم پہنچاتا ہے۔ جس طرح شکر خورے کو شکر۔ میں واعظ خشک ہوں۔ اس لئے زیادہ تر حقیقت نگاری سے کام لیتا ہوں۔ مگر میں آپ کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں۔ کہ بھئی مضمون خشک سہی۔ مگر بقول شاعر "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے"۔ تو اسکے متعلق یہ عرض ہے کہ جس دنداں ساز سے میں دانت نکلوانے گیا تھا۔ وہ مرد تھا۔ اگر وہ صنف نازک کی قسم سے ہوتا۔ تو شاید رومان کے لئے کوئی گنجائش نکل آتی۔ اگرچہ ایسی حالت میں جبکہ دانت کا درد ہو رہا ہو۔ عشق کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ مگر پھر بھی ایک آدھ رومانی واقعہ کا رونما ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں۔ مثلاً "جیسے ہی وہ زہرہ جبیں میری طرف بڑھیں اور میرے چہرے پر نظریں ڈال کر دیکھا۔ تو محسوس ہوا جیسے دانت کا درد کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ دانت کے درد کی جگہ دردِ جگر نے لے۔ یا جس وقت وہ اپنے نرم اور نازک ہاتھوں سے میری داڑھ نکالیں۔ تو مجھے اسقدر مسرت ہو کہ دل چاہے۔ ایک ایک کر کے سارے دانت نکلوا ڈالوں"۔۔۔۔ مگر ایسی باتیں صرف رومانی ادیب ہی لکھ سکتے ہیں۔ اور میں جو کچھ ہوں وہ بتا ہی چکا ہوں۔ اس لئے میری معذوریوں کا خیال رکھتے ہوئے۔ آپ مجھے معاف فرمائینگے۔

اچھا۔ تو اب اجازت ہو، تو کچھ عرض کروں۔۔۔۔۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ شاکر سے شاکر انسان بھی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا۔ اس فقرے کی صداقت کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ جن کو شیکسپیئر یا میری طرح کبھی دانت کا درد ہوا ہے۔ ورنہ عام انسان تو اس فقرے کو پڑھ کر بے اختیار مسکرا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ یہ شیکسپیئر بھی کتنا سادہ لوح آدمی تھا۔ اگر دانت کے درد کی بجائے قولنج کا درد۔ یا جگر کا درد لکھ دیتا۔ تو شاید میں مان جاتا۔ مگر دانت کا درد!۔۔۔ حتےٰ کہ کسی دن اُس کو اچانک رات کے ۱۱ بجے دانت کا درد آ دباتا ہے۔ پہلے پہلے وہ شاکر بنتے اور شیکسپیئر کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اور دل کو یُوں تسلی دیتا ہے۔ کہ آخر غالب مرحوم نے بھی تو فرمایا ہے کہ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"۔ پھر خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر جب دو دن کے بعد یہ درد اُسے رات کو مطلقاً سونے نہیں دیتا۔ اور اس کی وجہ سے وہ گھر میں کسی اور کو مطلقاً نہیں سونے دیتا۔ تو اُسے شیکسپیئر کی بات کا کچھ کچھ یقین ہونے لگتا ہے۔ اور تیسرے دن علی الصبح وہ اپنے آپ کو کسی دندان ساز کے ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا پاتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال پچھلے ہفتہ میرا ہوا۔ ویسے تو میں تقریباً ہر درد سے آشنا ہوں۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ دانت کے درد میں وہ تڑپ پوشیدہ ہے۔ کہ دردِ دل۔ دردِ جگر وہ۔ دردِ جگر تو اسکے مقابلہ میں "عین راحت" ہیں۔ چنانچہ جب متواتر تین رات کراہنے اور ہر ہمسائے کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تو میں نے ڈاکٹر اندر کمار کی دوکان کا رُخ کیا۔ آپ دانتوں کی بیماریوں کے ماہر ہیں۔ اور دانت بجلی سے نکالتے ہیں شاید مؤخرالذکر چیز نے مجھے اُن کی جانب رجوع کرنے کو اکسایا۔ کیونکہ درد اس حد تک پہنچ چکا تھا۔ کہ بجلی کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز مجھے بچاسکتی۔ چنانچہ میں نے اُن کی دکان میں لپکتے ہوئے کہا۔ "میری بائیں داڑھ فوراً بجلی سے نکال دیجئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے میری طرف تکتے ہوئے کہا "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "آپ مجھ سے راہ و رسم بعد میں بڑھا سکتے ہیں۔ پہلے میری بائیں داڑھ نکالئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "تشریف رکھئے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی نکالے دیتا ہوں" اسکے بعد آپ نے مجھ پر سوالات کی بمباری شروع کر دی۔ مثلاً "کب سے درد ہے؟ کیوں درد ہے؟ اوپر والی داڑھ میں ہے یا نیچے والی داڑھ میں؟ اس سے پہلے بھی کبھی دانت نکلوایا ہے؟ کیا صرف ایک ہی دانت نکلوانا چاہتے ہیں؟

اب میں تھا کہ درد سے بیتاب ہو رہا تھا۔ اور ہر سوال کے جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب تھے۔ کہ برابر مسکرائے جارہے تھے اور جب میں درد سے کراہتا تو اُن کی مسکراہٹ زیادہ دلآویز اور دلکش ہوجاتی۔ آخر جب اُنہوں نے دو تین دفعہ میرے منع کرنے کے باوجود اچھی طرح داڑھ کو ہلایا۔ اور دیکھا کہ شدتِ درد سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوا چاہتی ہے۔ تو انہیں یقین ہوگیا۔ کہ واقعی دانت کا درد ہے۔ اسکے بعد اُنہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود دو تین اوزار گرم پانی میں اُبالنے لگے۔ میں نے کہا۔ اجی حضرت جلدی کیجئے۔ بجلی سے میری داڑھ نکالئے" کہنے لگے "آج بجلی خراب ہوگئی ہے۔ اسلئے داڑھ ہاتھ سے ہی نکالنا پڑے گی"

جتنا عرصہ اوزار گرم ہوتے رہے۔ وہ مجھے دانت کی خرابیوں سے پیدا ہونے والی بیماریوں پر لیکچر دیتے رہے۔ اُن کے خیال کے مطابق دنیا کی تمام بیماریاں دانتوں ہی کے خراب ہوجانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بدہضمی سے تپ دق تک جتنے امراض ہیں۔ اُن کا علاج داڑھ نکلوانا ہے۔ اس لیکچر میں آپ نے اس ملک کے لوگوں کی عادات پر بھی کچھ تبصرہ کیا۔ مثلاً "یہاں کے لوگ بے حد بے پرواہ واقع ہوئے ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ میں ہر ایک آدمی سال میں چار دفعہ دانت صاف کرواتا ہے۔ مگر یہاں لوگ اُس وقت تک دندان ساز کی دکان کا رُخ نہیں کرتے۔ جب تک دانت کو کیڑا لگ کر سارا مسوڑہ تباہ نہ ہوجائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی بھی دانتوں کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ اگر لوگ ذرا محتاط ہوں۔ تو آج اُن کی مشکلیں حل ہو جائیں۔

اس قسم کے متعدد جملے وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئے۔ حتٰی کہ مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ ہمارے ملک کے سچّے خیرخواہ صرف آپ ہیں۔ اور اگر آپ نہ ہوتے تو خدا جانے ہمارے ملک کی کیا حالت ہوتی۔

جب اوزار گرم ہوچکے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اب انجکشن ہوگا۔ انجکشن کے نام سے مجھے روز اوّل ہی سے چڑ ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں انجکشن مہذب طریقہ سے ایذا پہنچانے کا دوسرا نام ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یقین دلایا۔ کہ انجکشن سے کسی قسم کا درد نہیں ہوتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے تھے۔ کیونکہ انجکشن سے کافی درد ہوا۔ انجکشن کرنے کے دو تین منٹ بعد اُنہوں نے زنبور پکڑا۔ اور اب مجھے وہ انسان کی بجائے موت کا فرشتہ نظر آنے لگے۔ دل میں آیا کہ ہمت کرکے بھاگ نکلوں۔ میں اٹھا ہی چاہتا تھا۔ کہ اُنہوں نے ذرا نرمی سے کہا۔ "میں آپ کو بارھویں دفعہ پھر یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو مطلقاً درد نہیں ہوگا"۔ میں نے دبی زبان سے کہا "میں آپ کو بارھویں دفعہ یقین دلاتا ہوں۔ کہ مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں"۔ مگر اُنہوں نے معاملہ کو طول نہ دیتے ہوئے مجھے منہ کھولنے کو کہا۔ وہ داڑھ کو زنبور کی گرفت میں لائے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ اب وصیت کرنے اور احباب و اقربا کو آخری تلقین کرنے کا وقت آپہنچا۔ اُنہوں نے زنبور کو جھٹکا دیا اور درد حد سے گزر کر "قضا" معلوم ہونے لگا۔ انہوں نے دوسرا جھٹکا دیا۔ اور میں سمجھا کہ اب اُنہوں نے مجھے ضرور جان سے مارنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اسکے بعد داڑھ اور زنبور میں ایک باقاعدہ کشتی شروع ہوئی۔ داڑھ اپنی جگہ پر اس طرح قائم تھی جس طرح

قطب مینار ہزاروں زلزلوں کے باوجود بے تمک اپنی جگہ پر جما ہے۔ مگر اس کھینچا تانی میں میں مفت میں ذبح ہو رہا تھا۔ یہ کشتی یا کشمکش کافی عرصہ تک جاری رہی اور آخر بزور اور دانت میں یہ تصفیہ ہوا کہ آدھی داڑھ زنبور کے منہ اور آدھی میرے منہ میں رہے۔ ڈاکٹر صاحب اسوقت پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ انکی گھبراہٹ دیکھ کر قریب تھا کہ میں بھی ہوش و حواس کھو بیٹھوں۔ مگر انہوں نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "تو یہ کتنی گہرائی میں ہے یہ داڑھ۔ بہت کوشش کی کہ نہ ٹوٹے۔ مگر ٹوٹ ہی گئی"

درد سے کراہتے ہوئے میں نے کہا۔ "اب کیا ہوگا"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں"

اسکے بعد انہوں نے جس طرح میری باقی کی آدھی داڑھ نکالی۔ یہ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں دانت ٹوٹنے کا سانحہ کبھی پیش آیا ہو۔ بس صرف یہ سمجھ لیجئے۔ کہ میری وہی حالت تھی۔ جو آپ کی ہو۔ اگر میں آپکے بدن میں متعدد جگہوں سے لمبی لمبی سوئیاں چبھوتا جاؤں۔ اور ساتھ ساتھ آپ کو تسلی دیتا رہوں۔ کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ کی پیہم کوشش کے بعد ڈاکٹر صاحب باقی داڑھ نکالنے میں کامیاب ہو گئے!

اس عرصے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کئی بار اگلے جہاں پہنچا ہوں۔ اور کئی بار وہاں سے لوٹا ہوں۔ اور پھر آخر کار میں نے اپنے آپ کو نیم بسمل کی سی حالت میں ڈاکٹر صاحب کی کرسی میں بیٹھا ہوا پایا۔ جب کچھ ہوش سنبھالا۔ تو ایسا معلوم ہوا کہ منہ سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب ایک گلاس لیکر جس میں خون سے ملتی جلتی رنگت والی کوئی دوائی گھلی ہوئی ہے۔ کرسی کے نزدیک کھڑے ہیں۔ اسکے بعد چند ثانئے نہایت عذاب کی حالت میں گزرے۔ ڈاکٹر صاحب غرارے کرنے کو کہہ رہے تھے اور میں انہیں ایمبولینس کار کے لئے فون کرنے کو عرض کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا۔ کہ اسی حالت میں اٹھ کر نزدیک کے پولیس اسٹیشن میں جا کر اس سانحہ کی رپورٹ درج کراؤں۔ تو شاید ضرورت کے وقت کام آئے۔ بارے کہیں پندرہ منٹ کے بعد خون بہنا بند ہوا۔ کچھ ڈھارس بندھی۔ مگر اب سخت درد ہونا شروع ہوا۔ اور میں نے بہتری اسی میں سمجھی۔ کہ ڈاکٹر صاحب کی دوکان میں بے گور و کفن مرنے کی نسبت گھر لوٹ چلوں۔ تانگہ میں بیٹھ کر بڑی مشکل سے گھر پہنچا اور ایک گھنٹہ تک اوندھے منہ بستر پر لیٹا کراہتا رہا۔ اسکے بعد جوں جوں درد کم ہوتا گیا۔ گال سوجتا گیا۔ حتےٰ کہ دو تین گھنٹے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا میرے جسم پر کسی اور شخص کا چہرہ لگا ہوا ہے۔ اس وقت میں سمجھا۔ کہ کیوں میرے ہموطن دندان ساز کی دکان کا آسانی سے رُخ نہیں کرتے۔

احمد ندیم قاسمی

دھڑا دھڑ

(زیرِ تحریر ناول "پت جھڑ" کا ایک باب)

پروفیسر بننے سے پہلے انور ایک بیوی کا شوہر اور پانچ بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ تعلیم کے سارے زمانے میں وہ گرمیوں کی چھٹیوں پر اپنے قصبے میں آتا۔ اور جب دوسرے سال درختوں کے ٹھنڈے زمردیں کونپلوں سے سجنے لگتے۔ تو اسے اطلاع ملتی کہ اُس کے ہاں ایک بچہ ہوا ہے۔ بہار کا موسم اس کے لئے ایک حادثہ بن کر رہ گیا تھا۔ کرسمس کے بعد اس پر بہار کا بھوت سوار ہونے لگتا۔ وہ کھوکھلا سا ہو کر رہ جاتا۔ اور خود کو قتل کا ایک ایسا مجرم محسوس کرتا۔ جیسے پھانسی کی تاریخ بتا دی گئی ہو۔

اس نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تو دنیا میں اکٹھا دو حادثے ہو گئے۔ اُدھر ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ ادھر انور کی شادی ہو گئی۔ ان دنوں وہ عنفوانِ شباب کے اس درجے پر تھا۔ جب کسی نہ کسی سے مجنونانہ محبت کرنا فریضہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب سناٹے گونجنے لگتے ہیں، سارے شہر کی لڑکیاں دروازے پر دستک دیتی محسوس ہوتی ہیں اور بیداریوں میں نیندوں کا لطف آتا ہے۔ اس تحریک کی رسمِ افتتاح کے لئے ابھی تک وہ کوئی مناسب انتخاب نہیں کرنے پایا تھا۔ قصبے کی لڑکیوں کے انداز کچھ ایسے بے ڈھب سے تھے۔ کہ وہاں کے دورانِ قیام میں وہ ہمیشہ گوگو کے عالم میں ہی رہا۔ اور شہر میں آتے ہی آئینہ اُس کا منہ چڑانے لگتا۔ جسم گٹھا ہوا سہی۔ بالوں میں لہریں سہی، رنگ نکھرا نکھرا سہی مگر جلال کے چہرے پر وجاہت کا ہالہ اور حامد کے ہونٹوں کی سکندرانہ تراش اور سبطین کی آنکھوں میں تندرستی کے چراغ! - اسے اپنی محرومی کا شدید احساس پریشان کر دیتا۔ وہ آئینے سے ایک خاموش مباحثہ کرتا — چہرے کو دیکھنے کے زاویئے ہوتے ہیں۔ اب یہاں سے میرا منہ تھوتھنی بنکر لٹک رہا ہے۔ تو ادھر سے — اُسے بائرن کی تصویر یاد آ جاتی — اور وہ مسکرا کر زاویہ بدل لیتا۔ مگر یہاں سے اس کے کان نہایت بھدے طریقے سے نمایاں ہونے لگتے۔ بالوں کو کانوں پر گرا کر وہ اس نقص کا مداوا ڈھونڈ لیتا۔ تو اُسے اپنی آنکھیں بہت پیاری لگنے لگتیں۔ بالکل بادامی۔ یونان کے دیوتاؤں کی سی آنکھیں۔ مگر اب ان آنکھوں کے ساتھ یہ لٹکتی ہوئی سی بالکل جھولتی ہوئی سی ناک — وہ سر جھٹک کر سوچتا۔ تاثر مجموعی حیثیت کا اندازہ لگانے سے ہوتا ہے عمارت کی ایک ایک ایلمنٹ پر کھی جائے تو فنِ تعمیر منہ تکتا رہ جائے۔ دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ عمارت کو گنبدوں میناروں کنگروں اور محرابوں نے کیسا دلہن بنا رکھا ہے۔ اور اتنی پیاری آنکھوں، بھرے گالوں، کھنچی ٹھوڑی اور گہرے گوشوں والے ہونٹوں کے درمیان یہ ناک اچھی نہیں تو بری بھی نہیں لگتی — وہ آئینے پر جھک جاتا اور اُس کی ناک جیسے ہنسنے لگتی۔

ایک بار شہر میں ایک لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اور جب وہ اپنے کمرے میں آیا تھا تو یہ مسکراہٹ اس کے ذہن سے چمٹی چلی آئی تھی۔ اور رات کو اس نے یہ مسکراہٹ اپنے ذہن سے الگ کر کے اپنے سامنے رکھ لی۔ جیسے ٹوپی اتار کر میز پر دھر دی جائے۔ اس مسکراہٹ سے اس نے بے شمار تاویلیں نچوڑیں اور جب صبح کو اس نے اُدھر کا قصد کرنا چاہا تو آئینہ میز پر سے اچک کر اسکے سامنے آ گیا۔ اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے کالج بھی نہ گیا۔ دوسرے روز آئینے کی گستاخ بیانی سے بے پرواہ ہو کر وہ اسی سڑک پر جا نکلا اور جب منزل قریب آئی۔ تو وہ یوں سیدھا آگے نکل گیا۔ جیسے کسی فوجی دستے میں مارچ کرتا جا رہا ہو۔ بہت لمبا چکر کاٹ کر وہ واپس آیا۔ چند روز ارادوں میں زندگی بھونکنے

میں گزرے — اور پھر امتحان کی تیاریاں ہونے لگیں۔

امتحان سے فارغ ہو کر وہ قصبے میں آیا تو چٹان کے نیچے سے ایک ننھی منی کلی نے جھانکا اور جب چند مہینوں کے بعد نتیجے کا اعلان ہوا اور پھر اس کی شادی ہو گئی۔ تو چٹان نے کروٹ بدلی اور نودمیدہ کلی کچلی گئی۔ زاہدہ ایک تنومند سی لڑکی تھی۔ ہر چیز کو یوں دیکھتی تھی۔ جیسے ہر چیز پر اسے اعتراض ہے۔ اور اسے انور پر بھی اعتراض تھا۔ ستمبر میں وہ واپس شہر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ تو زاہدہ نے کہا تھا۔

"اب آپ کب لوٹیں گے" وہ کچھ اس طرح بولی تھی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو کہ اگر آپ جلدی واپس نہ آئے۔ تو آپ کی کھوپڑی توڑ دوں گی۔

"آئندہ گرمیوں میں" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"ایک سال بعد؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"طالب علم بھی ہوں نا۔ صرف دولہا تو نہیں ہوں" اس نے تلخی سے کہا،

زاہدہ نے اُسے نظروں سے ڈپٹ کر پوچھا۔ "دماغ کہاں ہے آپ کا؟"

"کھوپڑی میں" اس نے الماری سے ایک کتاب نکالتے ہوئے کہا۔

اور زاہدہ غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی،

دراصل اپنے ذہن میں اُس نے ایک عورت کے لئے جو سانچا تیار کر رکھا تھا۔ وہ زاہدہ سے قطعی مختلف تھا۔ اور پھر جب سال کا بیشتر حصہ شہر میں جا کر گزارتا تو زاہدہ سے اور دُور ہو جاتا۔ سنہ ۶۳ء کے موسم بہار میں اُسے ایک بیٹے کی آمد کی اطلاع ملی۔ اور وہ دنوں تک لڑکوں سے یوں کتراتا کتراتا پھرتا رہا۔ جیسے اُسے کسی نے چھو لیا۔ تو اس کا انگ انگ پکار اُٹھنے لگا یا "میں باپ بن چکا ہوں یارو —"

"اکبر" — اُس نے نام تجویز کیا۔ اور پھر دوسرے موسم بہار میں ایک اور بیٹا آنکلا۔ "اصغر" اُس نے زاہدہ کو خط لکھا — ساجدہ! یہ تیسرا موسم بہار تھا" اور جب سنہ ۱۹۶۶ء میں وہ ایم اے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تو اُسے اطلاع ملی "بیٹا ہوا ہے، نام تجویز فرمائیے"۔ دیر تک بہت گھناؤنے گالیوں ایسے نام اُسکے ذہن میں تیرتے رہے، اور خوشبو سے لدی ہوئی ہوا اُس کے آس پاس تعفن سا برسانے لگی۔ لیکن اچانک اُسے زرد رو زاہدہ نظر آئی، جس کے پہلو میں ایک ننھا آنکھیں بند کئے غوں غاں کر رہا تھا۔ "اطہر" اُس نے جواب لکھا، اور جب امتحان سے فارغ ہو کر قصبے میں گیا۔ تو یہ تہیہ کر کے کہ چار بچوں کے بعد حیوانیت کا درجہ ہے۔ اور انسانیت کے مدنظر وہ محتاط رہے گا مگر زاہدہ کے تیوروں میں تلواریں تھیں، اور انور میں اتنی قوت نہیں تھی۔ کہ زخمی ہو کر بھی اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے، بے بسی کے اس احساس نے زاہدہ کو ایک ٹرنک کی حیثیت دے دی۔ اور وہ اسے اپنے بزرگوں کی یادگار سمجھ کر برداشت کرتا رہا۔ بیوی کے حقوق ہوتے ہیں، وہ سوچتا تھا — مگر حقوق کا اتنا ہجوم بھی تو نہیں ہوتا — وہ دوبارہ سوچتا۔ اور اس کشمکش میں راضی برضا ہو کر زاہدہ سے کبھی کبھی پیار کی باتیں بھی کر لیتا، اور جب پیار کی ان باتوں میں اسے لطف آنے لگتا۔ تو اطہر مارے پیاس کے بلکنے لگتا، ساجدہ چینی کی پلیٹ گرا دیتی۔ اکبر اور اصغر مرغی کو دبوچ کر اس کی دم کے پر نوچنے لگتے، فضا سے چیخوں اور تالیوں اور دھماکوں کا ایک طوفان اُترآتا۔ اور وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں جا نکلتا،

نزدیک و دور کے سب رشتہ داروں کے ہاں جانا اُس کا پرانا معمول تھا۔ خاندان میں جب بھی کسی نوجوان کے غرور یا بے نیازی یا ہٹ کا ذکر چھڑتا۔ تو بزرگ انور کی مثال پیش کرتے۔ "بالکل ایسا لگتا ہے۔ جیسے عزیزوں کے ہاں جانا ہی اس کی زندگی ہے، سعادت مندی اسے کہتے

(بقیہ برصفحہ ۸)

آج چچا شہباز کا منہ کچھ اترا سا تھا۔ اُن کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ اور سنجیدگی کی یہی وہ تہ تھی۔ جو اُن کے ماتھے پر تفکر کے آثار بنکر نمایاں تھی۔ اُن کی کشادہ پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ لانبی لانبی چار لکیریں اور یہی وجہ تھی۔ کہ دادی اماں سے لے کر چھوٹے بھائی بہن سب کا خیال تھا کہ وہ قسمت کے دھنی ہیں۔ مگر یہ سیدھی سادی لکیریں جو اُن کی قسمت کو تابناک بنا رہی تھیں۔ اس وقت نظر آتی تھیں۔ جب چچا شیخ شہباز اُداس ہوں، جب وہ کسی گہری فکر میں غوطے لگا رہے ہوں، جب اُن کی کشادہ پیشانی جھوٹوں سے آکر لگ جاتی ہو۔ فساد کے دنوں میں، میں نے اکثر ان کے ماتھے پر ان دھنی لکیروں کو ابھرتے دیکھا ہے۔ اور آج بھی جب وہ ہندو اور مسلمانوں کے ڈبے اسٹیشن پر تلاش کر رہے تھے۔ تو بھی مجھے ان کی پیشانی پر وہی لکیریں تیرتی نظر آئیں ——

یوں تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت، جو یا تو گھر کے کونوں میں زمین کے اندر دفن تھی۔ یا پھر گیہوں اور دھان کے کھیت میں جو ہر سال چچا شہباز ہی کیا سارے گھر کے لئے سونا اگلتے تھے، جب گھر کے صحن میں غلہ کا ڈھیر لگ جاتا۔ تو سارا گھر ہنستا ہوا نظر آتا اور چچا شہباز کی باچھیں کھل جاتیں۔ اسوقت اُن کی چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی بھی ہلنے لگتی۔ اور اس وقت ماتھے پر شکن کے آثار کہیں نظر نہ آتے اور یہی وہ دن تھے۔ جب چچا شہباز کو اپنی خاندانی روایات یاد آجاتیں۔ جب ہمارا صحن کاشتکار کا کھیت بنجاتا تو پھر سب لڑکیاں چچا شہباز سے اپنا حق طلب کرنے لگتیں اور چچا شہباز کچھ اس طرح حق بانٹتے۔ جیسے شادی بیاہ کے موقع پر نائینوں اور ڈومنیوں کو ان کا حق دیا جاتا ہے! —— اور یہی وہ حق تھا جس نے ہمارے سارے حقوق چھینوا دیئے تھے اور چچا شہباز کو ہم پر ٹھیک اسی طرح حق حاصل تھا۔ جیسے ان کو اپنی زمین پر تھا جیسے ان کو کلوا کاشتکار پر تھا

کلوا کاشتکار ہمارے ہی گاؤں کا کسان تھا اور اب کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی بھویں سفید ہو ہو کر جھڑنی شروع ہو گئیں تھیں۔ اور آج جب اُس کی چار لڑکیاں جوان تھیں اور بیاہ لائق —— تو وہ بدستور اسکے گھر میں شوف پھٹکتی تھیں اور کلوا کاشتکار چپ چاپ ہمیشہ کی طرح اپنے کھیت میں ہل چلایا کرتا تھا اور جنہوں نے اُسے دیکھا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کے ماتھے پر بھی چار سیدھی لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور جو اس کے ماتھے پر جھریوں کی طرح نظر آتی تھیں —— اور دادا کے زمانے سے آج تک اُس کا یہ معمول تھا۔ کہ ہر بازار کے دن زمیندار کو سلام کرنے کے لئے قصبے ضرور آتا۔ آندھی آئے یا پانی لیکن اسکے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور چچا شہباز دادا کے مخصوص لہجے میں مسکرا کر کہتے۔

"کیوں بے کلوا مزے میں،، اور پھر اُسکے بعد اُن گالیوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہو جاتا جیسے موسلا دھار بارش اور منی مجھ سے ہمیشہ یہی سوال کرتی "آپا! یہ کلوا کاشتکار آخر ہر بازار کے دن یہ ڈانٹ اور گالیاں سننے کیوں آکھڑا ہوتا ہے؟" اور میں اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے دور آسمانوں میں دیکھنے لگتی۔ یا پھر ریشم کے نرم تاروں میں سوئی کو الجھا دیتی۔

جب چچا شہباز نے بے چارے کلوا کو اُس کی آبائی زمین سے بے دخل کرنا چاہا۔ تو بھی اس نے اُس روایت کو برقرار رکھا اور ہر ہفتہ اُسی طرح منہ لٹکائے چلا آتا، ادھر چچا شہباز اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ کہ وہ زمین اُس کے قبضے سے نکال لیں۔ اور اپنے ڈھوروں کے چارے کی ڈھیر، کے لئے استعمال

کریں اور اس بار تو کیا چچی سے بھی نہ رہا گیا اور اُنہوں نے بھی دھیمی زبان سے پوچھ ہی لیا "آخر کلوا کو بے دخل کرنے کی کیا ضرورت تمہارے پاس چری کے لئے یوں بھی تو کافی زمین ہے۔ پھر چری بھی مل جاتی ہے۔ اور سال بھر کے خرچ سے اوپر غلہ کوٹھی میں بھر جاتا ہے —— بے چارے کے چار جوان لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہیں، اس بڑھاپے میں اس کا اور کوئی سہارا بھی تو نہیں —— پھر باپ دادا کے زمانے سے رہتا چلا آیا ہے۔ اور پھر بہ ہفتے —— " مگر چچا شہباز نے فوراً بات کاٹ دی اور غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے ——

"کلوا کاشتکار!! —— میں دیکھوں گا اب اپنی پگڑی کس طرح سنبھالتا ہے بڑا اکڑ کر چلتا ہے یہ شیخ جی کا طفیل ہے جو گاؤں میں اپنی عزت ڈھانکے پھرتا ہے۔ دروازہ پر بیلوں کی جوڑی بندھی ہے ورنہ یہ بنتے اس کی فرقی نہ کر ڈالتے تو بات تھی۔"

"کیسی فرقی" —— چچی نے فوراً پوچھا،

اور اس روز چچا شہباز نے بتایا کہ کلوا ساڑھے نو سو روپے کا مقروض ہے۔ اور ہم سب کو اس پر رحم آیا۔ مگر ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ آخر ہم پر بھی تو چچا شہباز کو اُسی طرح حق حاصل تھا۔ جیسے اُن کو اپنی زمین پر تھا یا کلوا کاشتکار پر —— اور چچی بھی کچھ بول نہ سکیں۔ اس لئے کہ وہ اُن کی منکوحہ تھیں۔ اور بیس ہزار کے مہروں کے عوض اس چہار دیواری میں داخل کی گئی تھیں۔ اب تو خیر وہ کچھ کچھ بولنے بھی لگی تھیں۔ اور اس گھر پر اپنا حق بھی سمجھنے لگی تھیں۔ ورنہ مجھے تو وہ دن بھی یاد ہیں جب چچا شہباز کے نکاح کو تین برس ہو گئے تھے اور ہرے بھرے پیڑ پر —— جھوٹے سے بھی کوئی بور نہ آیا —— اور پھر چچی کے ماتھے پر بھی وہی شکنیں سی نمودار ہونی شروع ہو گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے ماتھے پر ویسی شکنیں نہ پڑتی تھیں۔ جیسی کہ چچا شہباز کے ماتھے پر، چار لانبی لکیریں —— اور وہ بار بار آئینے میں ان لکیروں کو ڈھونڈا کرتیں۔ لیکن اُن کا ماتھا اتنا چوڑا تو نہ تھا کہ اُس پر تین چار لکیریں ایک ساتھ پڑتیں۔ چچا کا منہ اور بھی لٹک جاتا۔ اور کبھی اُن کا جی ایسا جھنجھلا جاتا کہ ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے وہ ان شکنوں کو اپنے ہاتوں سے اسی طرح مٹا دینا چاہتی ہیں۔ جس طرح وہ چچا شہباز کے بستر کی شکنیں مٹا دیا کرتی تھیں ——
مگر وہ جھنجلا کر وضو کر کے مصلے پر جا بیٹھتیں اور وقت بے وقت نفلیں پڑھنی شروع کر دیتیں۔ وہ رب العزت کے سامنے ہات پھیلائے منہ ہی منہ میں کچھ دعائیں مانگتیں اور آخر کار اُن کی دعا قبول ہو ہی گئی۔ اور اُن کے دن ایسے پلٹے کہ ان کو اپنے ماتھے کی شکن پر شک ہونے لگا۔ کہ وہ سیدھی ہی لکیریں ہیں، یہ آئینے ہی خراب ہیں۔ جو یہ شکنیں اس طرح آڑی ترچھی نظر آتی ہیں اور چچی کی گود میں چاند سا مکھڑا قلابازیاں کھانے لگا۔ اور پھر وقت کی بات دو سال بھی نہ گزرنے پائے کہ ایک اور لڑکی غوں غاں کرنے لگی اور چچی نے سارے گھر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ آخر کو بیاہتا تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ چچی دو چار کے سامنے کبھی کبھی اپنا حق جتا دیتی تھیں کہ "یوں ڈالی ہوئی تو نہیں ہوں، آخر پالکی میں لائی گئی ہوں" اور چچا شہباز پان کی گلوری منہ میں دبا کر باہر نکل جاتے ——

اور چچی کے دونوں بچوں کی غوں غاں سارے گھر میں گونجنے لگی۔ تو چچی اتنی گیانی ہو تیں کہ جب چھوٹے بتے نے پوچھا کہ "چچی یہ منّی کہاں سے آئی ہے،" تو وہ مسکرا کر ہمیشہ یہی جواب دیتیں۔

"بیٹے بلال خوری سے چار آنے کو لی ہے" اور اُن کی باچھیں کھل جاتیں، پھر چچی اسی طرح ہم سب سے بھی خوشی ہو ہو کر باتیں کرتیں۔ اسی طرح ہنسی مذاق میں سارا دن کٹ جاتا۔ مگر جب چچا شہباز گھر میں داخل ہوتے۔ تو سارے گھر میں سناٹا ہو جاتا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ آخر کو چچا شہباز کو ان پر بھی تو وہی حق حاصل تھا۔ جیسا کہ ان کو اپنی زمین پر تھا یا کلوا کاشتکار پر۔

وہ تو پرانی وضع قطع کے آدمی تھے، باپ دادا کی روایت بھی ورثے میں اسی طرح ملی تھی۔ جیسے وہ سونا اگلتی جائداد —— ایک کو لیتے اور دوسری کو چھوڑ دیتے یہ کیسے ممکن تھا اور یہی وجہ تھی۔ کہ جب ہمارے قصبے کی لڑکیاں اپنے گھروں میں بہت کچھ حقوق حاصل کر چکی تھیں۔ ہمارے لئے ہنوز دہ اول ہی تھا —— فیشن تو درکنار اپنی مرضی سے کپڑا پہننا تک دوبھر تھا۔ اُسی دن کی بات ہے۔ جب گھر میں دوپٹہ رنگنے کو کوئی رنگ موجود نہ تھا۔ منی بے چاری نے سفید دوپٹہ پہن لیا۔ اور اس پر نہ پوچھو گھر میں کیا حال ہوا۔ اور چچی کے روکنے سے بھی وہ طوفان نہ رک سکا ——

"بن بیاہی لڑکیاں بیواؤں کی طرح کپڑے پہنتی ہیں" اور چچی کی عمر بھی کوئی کم نہ تھی۔ وہ کب اس کو پسند کرتیں، مجبوری کی اور بات ہے۔ لیکن اُن کے

سامنے مجبوری ہی کیا تھی —— اور اس طرح چچا شہباز کے سامنے ہماری ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ چُھپتے ہوئے دُپٹے پہن کر چلے جائیں ——

—— ممی ابھی نو برس کی بچی ہی تھی کہ پردے کے پیچھے ڈال دی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے چچا شہباز اپنا روپیہ کوٹھڑی میں گاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ آخر اُس بے چاری کی عمر ہی کیا تھی۔ مگر کچھ روایات تھیں جو زمین و دولت، اور کلوا کاشتکار کے ساتھ اُن کے حصے میں آئی تھیں۔ اور وہ روایات شاید اتنی پرانی تھیں۔ جتنی دادی اماں کی کہاوتیں ——

اُسی دن کی بات ہے جب باہر تماشا ہو رہا تھا، اور چچا شہباز نے زمیندارانہ لاج رکھنے کے لئے محلے کے سارے بچوں کو ٹہور کر اپنے پیسے سے تماشا کرا دیا تھا، ممی دروازے میں پہنچ گئی اور جھروکوں سے جھانکنے لگی، کہیں چچا کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا برس پڑے، اور وہ غریب سر جھکائے اپنے کمرے میں چل دی اور چچی اس وقت مرغی خانے میں مرغیوں کو دربے دربے کر رہی تھیں —— وہ بھی آخر کیا بولتیں ——،

پھر چچا شہباز مونچھیں اینٹھتے ہوئے باہر نکل گئے، مونچھوں کے بال اور بھی زیادہ اکڑ گئے، یہ بات فخر کی تھی۔ کہ ان کے گھر کی عورتوں کا کسی نے آنچل بھی نہ دیکھا تھا۔ ہمارے مکان کی کتنی بڑی جیت تھی۔ مگر کوئی جھوٹے کو بھی یہ کہہ دے کہ اُس نے کبھی کبھی دس سالہ ممی کا کبھی آنچل دیکھا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ آج برادری میں جب کہ سب کے گھروں کے کانچ ٹوٹ چکے تھے۔ اُن کا شیش محل اسی طرح چمک رہا تھا۔ بلکہ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ دوسروں کے پتھر مارنے سے نہ چوکتے تھے اور اُن کے شیشے بے دھڑک توڑ ڈالتے تھے ——

لیکن آج شہباز خاں اُداس تھے۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ان کے ماتھے پر تفکر کے آثار تھے۔ ان کے ماتھے پر چار لانبی لانبی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ہماری لکھنؤ جانے والی گاڑی میں ذرا دیر تھی۔ اور چچا شہباز ہدایات دے رہے تھے اور ہمارے سب کے ہات میں ایک ایک ساری تھی، جو چچا شہباز نے کنٹرول سے دُگنے داموں پر خرید کر ہمیں لا دی تھی، وہ ساری جس کو ہم باندھ بھی نہ سکتے تھے اور وہ جس کے چمکتے ہوئے کنارے ہماری بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ہمارا مذاق اڑا رہے تھے۔ گویا ہمیں وہ دن یاد دلا رہے تھے۔ جب ہم نے چچا سے ساری کی فرمائش کی تھی۔ جس کے جواب میں اُنہوں نے اپنا کانچ کا گھر دکھا دیا تھا۔ شیش محل جو بدستور چمک رہا تھا جس پر ایک بال بھی نہ تھا اور اسی لئے اس میں رہنے والوں نے خاندانی روایات کا ساتھ دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے رہنے سہنے میں کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ اور پھر یہ ساری —— جس کے بارے میں اُنہوں نے اپنے انقلابی عزائم دکھائے تھے۔ کہ اگر ہمارے گھر میں ایک ساری بھی آئی۔ تو میں اس کو آگ دکھا دونگا، کیا یہ شلوار اور دُپٹے بدن کاٹتے ہیں۔ اور مجھے اس وقت معاً وہ سودیشی تحریک یاد آئی جب بدیسی کپڑوں کو جلا دیا جاتا تھا۔ ہم سب دم بخود ہو گئے وہ دن تھا اور آج کا دن جو کسی نے ساری کا نام لیا ہو۔ اور چمکدار کنارے والی ساری جو کنٹرول سے زیادہ کے داموں پر خریدی گئی گویا وہ ہم پر ہنس رہی تھی اور میری مٹھیوں کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی اور چچا شہباز برابر اپنی داڑھی پر ہات پھیر رہے تھے۔ اور کہتے جا رہے تھے۔

اوّل تو میں یہ کوشش کرونگا کہ ہو مسلمانوں کے ڈبے میں تمہیں بٹھا دوں لیکن اگر وہاں جگہ نہ ملی تو مجبوراً دوسرے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا۔ لیکن وہاں باتھ روم میں جا کر یہ سفید ساری پہن لینا۔ ورنہ مسافروں کا کیا بھروسہ کہیں کوئی مسلمان سمجھ کر —— "اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اس لئے کہ ہم سب سمجھ گئے تھے۔ اور پھر چچا شہباز بولے" دیکھو ٹرین میں اپنے بُرقعے سمیٹ کر احتیاط سے رکھ لینا کوئی ضرورت نہیں برقعہ پہننے کی —— اس برقعہ سے تو اور بھی معلوم ہو جائیگا۔ کہ تم لوگ مسلمان ہو، یہ پردہ وردہ طاق پر رکھو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ چچا بولے جا رہے تھے، پالکی بوڑھے کہاروں کے کاندھے پر جھول رہی تھی۔ جس پر ہم بیٹھ کر آئے تھے اور اس احتیاط سے بیٹھے تھے۔ کہ کسی نے ہمارے آنچل بھی نہ دیکھے ہوں ——

جب اسٹیشن پر ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے راجا کا محل اڑا اڑا دھم سے گر رہا ہے۔ اور جب چچا شہباز نے بات ختم کی۔ تو میری نظر پہلے اُن کے ماتھے پر پڑی جس پر سیدھی سادی چار لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں نے دیکھا کہ اُن کی مونچھوں کا بل ختم ہو گیا تھا اور وہ جھکی جھکی نظر آ رہی تھیں۔ اور ہمارے برقعے اُنہوں نے اپنے ہاتوں میں لے لئے اور انہیں چادر میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اور میں نے

(بقیہ بر صفحہ ۷۹)

سید امجد الطاف

کالو

میں تو بس ایک شاعر تھا حسن و محبت کے گیت بننے والا۔ اور ایڈیٹر صاحب! مجھے ان لڑائی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان گنت شہروں میں فساد کی وبا پھوٹی۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا۔ اور پڑوسی نے پڑوسی کے خون میں ہاتھ رنگے۔ لیکن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ میں اپنے چھوٹے سے آرام دہ مکان میں نہایت امن و سکون سے بیٹھا غزلیں کہتا رہا نظمیں لکھتا رہا، گیت گاتا رہا! اور آج وہ قصبہ ویران ہو چکا ہے۔ اس کی پاردیواری ڈھے چکی ہے وہ نظمیں، غزلیں اور گیت اپنا گلا آپ گھونٹ کر خاموش ہو چکے ہیں! —— وہاں میری ایک بیوی تھی اور ایک چار سال کا بہت ہی پیارا بچہ۔ میری دنیا بس ان ہی دو ہستیوں سے وابستہ تھی۔ باقی سب لوگ میرے دوست تھے، مرے بھائی تھے، مرے ہمسائے تھے اور میں نے انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ میری بیوی...... میرے لڑکپن کی محبوب اور میری جوانی کی ساتھی.... اب میں اس کی چال کی دلکشی، اس کی آنکھوں کا مستقل تبسم اور اس کے چہرے کا ملکوتی نور نہیں دیکھ سکتا، یہ سب کچھ مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اب اپاہج ہے۔ اس کی ٹانگیں چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھیانک خواب کی انگڑائیاں ہیں۔ اسکے چہرے کا نور ڈھل چکا ہے۔ اور یہ سب کچھ چھ گھنٹوں میں ہو گیا۔ صرف چھ گھنٹوں میں میرے لڑکپن کی محبوب ڈائن اور میری جوانی کی ساتھی ایک بوجھ بنکر رہ گئی۔ اگر اس وقت میرا بچہ میرے پاس ہوتا۔ تو شاید میرے لئے بہت بڑا سہارا ثابت ہوتا۔ اس کی نیلی نیلی معصوم آنکھوں میں اپنے ماضی کو ڈھونڈتا اور وہ سوتے پھر ابل پڑتے۔ جن سے میری نظمیں اور گیت رس لیتے تھے۔ اب تو میں اسے اپنے ماضی کے ساتھ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر چکا مستقبل میرے لئے ایک تاریک رات کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حالی ہمارا آپ پر ظاہر ہی ہے۔ پھر میں گیت کس زمانہ کے لکھوں۔ وہ حسن مر چکا۔ جو میرے ذہن میں شاعری کی روح پیدا کرتا تھا۔ اس محبت کو میں نے خود مار ڈالا جو کائنات کے ہر ذی روح کے ساتھ میں محسوس کرتا تھا۔

آپ لکھتے ہیں کہ پاکستان کے عوام میرا تازہ کلام پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایڈیٹر صاحب! پاکستان میں تو اس شاعر کا صرف ڈھانچہ پہنچا ہے گیت گانے والی روح تو قصبہ شاہ آباد کے محلہ مفتیاں میں اس جلے ہوئے سرخ مکان ہی میں بھٹک رہی ہے جس میں اب شاید کوئی میانوالی کا بیوپاری بنیا یا راولپنڈی کا کوئی سکھ کارخانہ دار اپنے عظیم الشان مکانوں اور بھری پڑی دکانوں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ وہ سادہ سا مکان میرے لئے کس قدر جاذبیت رکھتا ہے۔ نہیں ایڈیٹر صاحب! میں آپ کو کوئی نظم نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر فرصت ہو تو میں اس کتے کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ جو سامنے ملکہ کے بُت کی سیڑھیوں کے پاس پڑا سسک رہا ہے

اس کا نام کالو ہے۔ اس کی زندگی میں صرف چند ایک معمولی نشیب آئے ہیں۔ ورنہ یہ ایک سپاٹ میدان ہے۔ جس میں ہمارے کسی شاعر یا افسانہ نگار کو کوئی دلآویز پلاٹ نہیں مل سکتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ کہ یہ کس روز پیدا ہوا۔ کتوں کی زندگی میں تاریخ و سال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ زندگی ان کیلئے ایک طویل "آج" ہے۔ "کل" کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اور "آج" کا مطلب ہے روٹی —— روٹی حاصل کرنے کے لئے صاحب! ہم لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ پسینہ بہاتے ہیں۔ خوشامد کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ کام نہیں چلتا تو چوری سے بھی باز نہیں آتے۔ ہماری صحبت میں کئی نسلیں گزارنے کے باعث یہ باتیں ان کی فطرت میں بھی داخل ہو چکی ہیں۔ صرف ایک بری عادت یہ ابھی تک ترک نہیں کر سکے۔ روٹی دینے والے کے ہمیشہ شکرگزار رہتے ہیں۔ اپنے حق کو بھیک سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اپنے محسن کے قدموں میں لوٹ لوٹ جاتے ہیں

حتیٰ کہ جب وہ انتہائے محبت سے پریشان ہو کر انہیں ٹھوکر مارتا ہے۔ تو اس ٹھوکر کو سر آنکھوں پرلے کر اس کے راستہ میں بچھ جاتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے کالو کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ایک روز جب شام کے وقت سیر سے لوٹا تو میرا بوڑھا ملازم علیا ڈیوڑھی میں بیٹھا، روئی کی بتی دودھ میں بھگو بھگو کر اسے چٹا رہا ہے۔ ابھی اس آنکھیں بھی اچھی طرح نہیں کھلی تھیں۔ اور کیچڑ میں بُری طرح لت پت ہو رہا تھا۔

"پچھے پالنے سے ابھی جی نہیں بھرا بابا" میں نے ہنس کر کہا۔

علیا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

" میاں! بے چارے کی ماں مر گئی ہے۔ باہر اپنے بھائی کے ساتھ نالی میں پڑا رو رہا تھا میں اٹھا لایا "

" اور اس کے بھائی؟ "

علیا کے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا۔

" اسے اپنے لالہ گوبند رام کی بہو لے گئی ہے "

" بابا " میں نے ذرا چھیڑتے ہوئے کہا " جب تمہارا بیٹا تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ تو یہ جانور کب ساتھ دے گا۔ پھینکو اسے۔ کس جھنجھٹ میں پھنس رہے ہو "

" نہیں میاں۔ کتے میں بہت وفا ہوتی ہے۔ دیکھ لینا۔ میرا کالو آڑے وقت ضرور کام آئے گا "

تھوڑے ہی دنوں میں کالو نے آنکھیں کھول لیں۔ اور پھر وہ ڈیوڑھی سے اندر صحن میں اور صحن سے باورچی خانہ کی دہلیز پر پہنچ گیا۔

اسی زمانہ میں ایک روز ہمارے پڑوسی لالہ گوبند رام ہانپتے ہوئے اور کانپتے میرے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ اور ان کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی بولے۔

" بھیا! غضب ہو گیا۔ کیشو کا خط آیا ہے "

میں نے انہیں چارپائی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا

" کیا لکھا ہے کیشو بھائی نے۔ آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ "

" کیا بتاؤں بھیا۔ تم آپ ہی پڑھ لو "

خط بالکل مختصر تھا۔ کشور نے امرتسر سے لکھا تھا۔ کہ اگر پاکستان بن گیا۔ تو بڑا زبردست فساد ہو گا۔ ہو سکتا ہے۔ خون پانی سے بھی سستا ہو جائے۔ کاظم بھائی سے کہئے۔ کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ اپنی جائداد بیچ کر راولپنڈی کی طرف چلے جائیں۔

لالہ گوبند رام کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں کپکپاتی آواز میں بولے۔

" تو بھیا کیا صلاح تمہاری۔ کہو تو کوئی گاہک ڈھونڈوں؟"

اور میں نے ہنس کر کہا۔

" نہیں چچا۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ مانا یہ کلجگ ہے۔ پر انسان کا خون اتنا سفید نہیں ہُوا "

لالہ جی کے منہ پہ جیسے یکسر رونق آگئی۔

" تو پھر تم نہیں جاؤ گے؟ اچھا بھیا۔ بھگوان مالک ہے۔ کم سے کم میرے جیتے جی تو تمہارا بال بیکا ہو گا نہیں "

اسی وقت علیا کالو کو اٹھائے اندر سے آیا اور بولا

" میاں میرا کالو اب ڈیوڑھی میں پہرا دیا کرے گا۔ روز روز گوبی بی کے چھیٹے کھائے "

" سنا علیا کیا حال ہے " لالہ بولے۔

" شکر ہے لالہ۔ کہو ہمارے کالو کا بھائی تو راضی خوشی ہے "

" بھائی؟ ارے وہ بِسری تو مدین نکلی۔ بہو نے اس کا نام ہیراں رکھا ہے "

ایڈیٹر صاحب! آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے۔ آئیے ان سیڑھیوں پر کالو کے پاس بیٹھ جائیں۔ اب تو غریب سے سانس بھی نہیں لیا جاتا۔

ہاں تو لالہ گوبند رام کی بہو نے اس کی بہن کا نام ہیراں رکھا تھا۔ ایک دن یہ بہن بھائی اپنی ڈیوڑھیوں سے نکل کر گلی میں پہنچ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سونگھا۔ پہچانا۔ کوں کوں کے نعرے بلند کئے۔ تھوتھنیاں ملا کر ایک معانقہ کیا۔ اور پھر کالو ہیراں کو ساتھ لئے ہماری ڈیوڑھی میں آگیا۔ اور لالہ گوبند رام کی بہو چلائی۔

" بابا کہیں ہیراں کو ماس نہ کھلا دینا۔ ورنہ ہمارے کام کی نہ رہے گی "

علیا نے چیخ کر جواب دیا۔

"بیٹا۔ گھبرامت۔ ایسا کام بھلا میں کر سکتا ہوں۔"

اُدھر سے لالہ گوبند رام کی آواز آئی۔

"نہیں علیا کھلا دے جو تیرا جی چاہے۔ سالی ماس نہ کھائے گی۔ تو پہرہ کیسے دے گی"

اور میرے ننھے نے ہنستے ہوئے ان کی کالی کالی گردنیں اپنے گورے ہاتھوں کی ننھی ننھی مٹھیوں میں بھینچ لیں۔

ایڈیٹر صاحب! اُن دنوں میں اپنے ہندی گیتوں کا مجموعہ مرتب کر رہا تھا۔ اس لئے کالُو اور ہیراں کے روز بروز بڑھتے ہوئے تعلقات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ یوں بھی جانور پالنے کا شوق مجھے کبھی نہیں ہوا۔ اور میری بیوی کو تو کتوں سے ازلی نفرت رہی ہے۔ وہ نماز کی بہت پابند تھی۔ طہارت کے اصولوں پر جان دیتی تھی۔ اسلئے کلو زیادہ تر باہر ڈیوڑھی میں، گلی میں یا لالہ گوبند رام کی حویلی میں ہیراں سے کھیلا کرتا۔ اور ان کے ساتھ پھرا کرتا۔ مئی اور جون کے تمتماتے مہینے یونہی گزر گئے۔ اخباروں میں جھگڑے فساد کی بھیانک خبریں پڑھ پڑھ کر میں اُکتا گیا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہندو مسلمان بھائیوں کو کسی پاگل کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ لالہ گوبند رام اپنے بیٹے کی فکر میں کڑھتے کڑھتے بیمار پڑ گئے۔ کینیو کے خط اگرچہ اب بہت کم آتے تھے۔ لیکن ہر خط میں وہ امرتسر کی لڑائیوں کا ذکر پوری تفصیل کے ساتھ کرتا۔ اور خاتمہ پر ہمیشہ وہ مجھے صلاح دیتا۔ کہ جائداد بیچ کر کسی نہ کسی طرح راولپنڈی یا ملتان چلا جاؤں۔

پھر لالہ گوبند رام کے سمدھیانہ کے پندرہ بیس آدمیوں کا ایک قافلہ بڑے بڑے صندوق، بستر اور گٹھڑیاں اٹھائے شاہ آباد آ پہنچا۔ مظالم کی روح فرسا داستانیں ورد زبان کئے ہوئے۔ رمضان کا چاند ہوتے ہوتے ایسے کئی خاندان پہنچ گئے۔ قصبہ کی ہلکی پھلکی فضا میں ایک بھاری پن محسوس ہونے لگا۔ باہر سے آنے والوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا۔ کہ ہم ظلم کا بدلہ ظلم سے لیں گے۔ بابا علیا کی آنکھوں میں وحشت چھانے لگی اور ایک روز جب لالہ گوبند رام کی بہو نے لکڑی مار کر کالو کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ تو وہ میرے پاس آیا اور بولا۔

"میاں۔ خدا کے لئے میری بات مانو۔ اب یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی"

اور میری بیوی نے بھی کہا۔

"علیا ٹھیک کہتا ہے۔ شانتی نگر کی آنکھیں بدل گئی ہیں۔ لالہ چچا اچھے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ اب تو شانتی کے میکے والوں کا راج ہے"

اور میں نے سوچا یہ سچ ہی تو ہے۔ ہم لوگ اب کیسے یہاں رہ سکتے ہیں۔ ہیراں اور کالو ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ کیونکہ ہیراں ہندو ہے اور کالو مسلمان۔ ہیراں دال بھات کھاتی ہے۔ اور کالو گوشت۔ اسی لئے میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ عید کے بعد انشاء اللہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے"۔

عید کی رات کالو نے دردناک سُروں میں رونا شروع کر دیا۔ ہم اپنے مکان کی چھت پر چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔ میری بیوی نے ننھے کو اپنے سینہ کے ساتھ چمٹا لیا۔ اور کانپتی ہوئی میرے پلنگ پر آ بیٹھی۔

"میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔ کتے کا رونا منحوس ہوتا ہے"

"گھبراؤ نہیں لالہ چچا نے مکان خریدنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ پرسوں رجسٹری ہو جائے گی۔ اور ہم پاکستان چلے جائیں گے"

ہوا بالکل بند تھی۔ آسمان پر ہلکا ہلکا غبار چھایا ہوا تھا۔ اور تارے دھندلے دھندلے ہوئے جا رہے تھے۔ دفعتہً قصبہ کے دوسرے کونہ سے ایک شور اٹھا۔ اور کالو نے پھر ایک چیخ ماری۔

"میاں کچھ سنا؟" علیا نیچے صحن میں بڑبڑا پکارا۔

"کچھ شور سا ہے"

"بابا گلی میں کسی سے پوچھو تو کیا بات ہے" میری بیوی نے کہا

"علیا اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ دس منٹ۔ شور بڑھتا گیا۔ نعرے، گالیاں۔ چیخیں۔ پھر ایک دھماکے کی آواز آئی۔ اور ایک شعلہ ابھرا۔ پھر ایک اور۔ ایک اور۔ اور شعلوں کے ساتھ ساتھ وہ شور قریب آتا گیا۔ کالو سہم کر منڈیر کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس نے اپنی دُم ٹانگوں کے درمیان دبالی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کی مٹیالی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی ——— اور پھر علیا کی آواز آئی۔

" میاں حملہ ہو گیا"

ایڈیٹر صاحب! اس قسم کی داستانیں آپ بارہا سن چکے ہیں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگلے روز "باؤنڈری فورس" کے سپاہیوں

نے ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر کیمپ میں پہنچا دیا۔ جو قصبہ سے کچھ فاصلہ پر لگا دیا گیا تھا۔ میری گردن میں ایک گہرا زخم تھا۔ میری بیوی زندہ ہونے کے باوجود زندہ نہ تھی۔ علیا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ چکی تھیں۔ کالو کی پچھلی ٹانگیں ٹوٹ گئی تھی۔ اور ہم کیمپ میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سورج چمک رہا تھا۔ زمین تپ رہی تھی۔ ہم بول نہیں سکتے تھے۔ ہم رو نہیں سکتے تھے۔ ہم آنکھیں تک چار نہیں کر سکتے تھے۔ صرف کالو آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اور اس کی مجبور آنکھیں اپنے ننھے میاں کو ڈھونڈ رہی تھیں ——— میں حیران ہوں کہ ہمیں موت کیوں نہ آئی۔ ہم زندہ کیسے بچ گئے۔ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے ——— شاہ آباد کیمپ سے والٹن کیمپ میں ——— دوزخ سے جنت میں! اور اس جنت میں پہنچ کر بابا علیا ہم سے بچھڑ گئے۔ ان کی انگلیوں کے زخم بگڑ گئے تھے، ان میں چھوٹے چھوٹے سفید کیڑے رینگنے لگے تھے۔ میری گردن کا زخم گو آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا۔ پھر بھی مجھے اس قدر تکلیف تھی۔ کہ بابا جب رات کے پچھلے پہر میں اپنے آخری سانس لے رہے تھے۔ تو میں ان کے منہ میں پانی تک نہ ٹپکا سکا۔ میری بھیانک آنکھوں والی بیوی آسمان کی جانب ٹکٹکی لگائے چپ چاپ بیٹھی رہی اور بابا کا دم نکل گیا۔ اگلی صبح رضا کار آئے۔ انہیں ایک سُرخ چادر میں لپیٹا اور اٹھا کر لے گئے۔ کالو، جسے بابا اپنے زخمی ہاتھوں میں اٹھا کر پاکستان لے آئے تھے۔ آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا رضا کاروں کے پیچھے ہو لیا۔ اور آج ڈیڑھ سال بعد میری اسکے ساتھ پھر ملاقات ہوتی ہے!

ایڈیٹر صاحب! اگر وہ آوارہ بیکار کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی لئے کمیٹی کے چپڑاسی نے اسے کچلہ کھلا دیا۔ وہ کئی روز سے بھوکا تھا۔ اسی لئے اس نے بڑی رغبت سے زہریلے گوشت کا وہ ٹکڑا کھا لیا۔ وہ بے گھر بے در تھا۔ اسی لئے وہ مر رہا ہے۔ میں تمام عمر حسن و محبت کے گیت گاتا رہا ہوں۔ مجھے کڑوی کسیلی باتیں کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ انارکسٹ نہیں ہوں۔ سیدھا سادہ مسلمان ہوں اس کے باوجود آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ اگر آپ کے دل میں ذرا ہمدردی بھی موجود ہے۔ تو یہ پتھر اٹھا کر اسکے سر پر دے ماریئے۔ تاکہ اس جان کنی کا جلد خاتمہ ہو جائے۔ اور اگر ہو سکے تو سامنے لوڈیگز میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو اسمبلی چیمبر میں شور مچانے والے کئی اہل درد چائے کی پیالیوں میں غم ملت گھولتے ہوئے مل جائیں گے۔ ان سے کہئے۔ کہ اپنی چمکتی کاروں کو بیچ کر کچلہ خرید لیں۔ اور ان لاکھوں بے گھر بے در کتوں کی بیکار زندگیاں ختم کر دیں۔ جو اس پاک زمین پر بوجھ ہیں۔ جو آپ پر بوجھ ہیں۔ جو خود اپنے آپ پر بوجھ ہیں۔ جب تک یہ بوجھ ہلکا نہ ہوگا۔ پاکستان میرے رسیلے گیتوں اور نظموں سے محروم رہے گا۔ وہ صرف کالو جیسے کتوں کی کہانیاں ہی سن سکے گا۔ جن کی زندگیاں ایک ایسے سپاٹ میدان کی مانند ہیں۔ جس میں کسی شاعر یا افسانہ نگار کو کوئی دلآویز پلاٹ نہیں مل سکتا۔

بقیہ صفحہ ۶۵

دیکھا کہ چچا شہباز کے پیروں میں نقاہت آگئی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا۔ چچا کو اب ہم پر وہ حق حاصل نہ تھا۔ جو اُن کو اپنی زمین پر تھا۔ اور ہاں اب انہیں کلوا کاشتکار پر بھی وہ حق نہ تھا اسلئے کہ کل بازار کا دن تھا اور کلوا کاشتکار اُن کے حضور میں نہ آیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی آبائی زمین سے بے دخل ہو چکا تھا اور اب وہ کاشتکار نہ تھا۔ بلکہ ایک مزدور کسان تھا۔ اُس کی جوان لڑکیاں ابھی تک بے بیاہی بیٹھی تھیں۔ اور بدستور اُسکے گھر میں سوپ پھٹک رہی تھیں، اور اُس کے گھر پر ساڑھے نو سو روپے کی بنئے کی قرقی آنے والی تھی۔ اور اس کی بیلوں کی جوڑی کے سامنے سوکھا چارہ پڑا تھا وہ بھوکا تھا ——— اس کا سارا گھر بھوکا تھا اور بیلوں کی جوڑی اُس کے تھان سے کھلنے والی تھی ——— اور ہم سب تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے انٹر کلاس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہماری ساریاں ہاتوں میں تھیں اور ہم تینوں نے انہیں اور بھی تیزی سے پکڑ لیا۔ وہ سفید ساری اس طرح لپٹی ہوئی جیسے مردے کا کفن یا بیوہ کے کپڑے ——— مسلمانوں کے لئے جو ڈبہ تھا وہ اتنا کھچا کھچ بھرا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، ہم مجبوراً انٹر میں چڑھنے کی سوچ رہے تھے اور چچا شہباز اس ڈبے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قدم تولتے ہوئے، مسافروں کو پرکھتے ہوئے۔ مگر اُن کے ماتھے پر اب چار کے بجائے پانچ شکنیں تھیں۔ اُن کی مونچھ کے بال جھک گئے تھے۔ اُن کو کلوا کاشتکار پر بھی وہ حق حاصل نہ تھا اور رکا پنج کے گھر میں ایک نہیں ہزار ہا بال پڑ چکے تھے۔ بس اتنی دیر تھی۔ کہ کوئی کنکر مارے وہ چھنا چھن کی آواز گونج اٹھے۔

ایوّب سرور

آزمائش

بازار کے بیچوں بیچ اُس کی ہوزری کی دوکان تھی۔ یہ بازار شہر کے پُر رونق حصے میں تھا۔ جہاں صبح سے شام تک چہل پہل رہتی تھی۔ خریدار اُس کی دوکان پر آتے رہتے۔ کچھ نہ کچھ سامان بھی فروخت ہوتا رہتا۔ لیکن پھر بھی حساب کرنے پر وہ گھاٹے ہی میں رہتا۔ اس مہینہ میں اتنا نقصان ہوا۔ دوسرے مہینے میں کچھ اور زیادہ نقصان ہوا۔ یا اتفاق سے کسی مہینہ میں آمد و خرچ برابر ہوگیا۔ یُوں اُس کی اپنی پونجی کم ہوتی چلی گئی۔ پھر قرض چڑھنے لگا۔ اور یہ قرض بڑھتا ہی چلا گیا۔ آہستہ آہستہ قرض خواہوں کے تقاضوں میں سختی آنے لگی۔ اور اُسے کوئی ایسی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ کہ جس سے کوئی نفع کی صورت بن سکے۔

اُس بازار میں اور دکاندار بھی تھے۔ اُس کے دائیں جانب لالہ جے مل کی دوکان تھی۔ اس دوکان ہی میں سے اُنھوں نے دو کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ اور چھاؤنی میں اب ایک بہت بڑی دوکان گرانڈ بازار کے نام سے کھولی تھی۔ جس میں دنیا بھر کی چیزیں مل سکتی تھیں۔ لالہ جے مل کا بڑا بیٹا اس دوکان پر بیٹھتا تھا۔ وہ خود اپنی اس چھوٹی سی دوکان ہی میں مگن تھے۔ بائیں ہاتھ والے الٰہ دین کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔ حالانکہ وہ عیاشی اور شراب خوری کے باعث تین مرتبہ دیوالہ نکال چکا تھا۔ اور اب اُس نے دو سالہ پوتے کے نام سے کاروبار کر رکھا تھا۔ اس پر بھی الٰہ دین کی مالی حالت اس سے ہزار درجہ بہتر تھی۔ اس کی دوکان کے بالمقابل اُسکے دوست محمود کی دوکان تھی۔ اگرچہ محمود نے بہت کم سرمایہ سے کام شروع کیا تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنے لئے ایک مکان خرید لیا تھا۔ اور تھوڑا بہت روپیہ بھی پس انداز کر رکھا تھا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر وہ سوچتا۔ کہ پھر اس پر یہ مصیبت کیوں ہے؟ ہر روز نماز کے بعد وہ گڑگڑا کر اللہ میاں سے دعائیں مانگتا۔ کہ وہ اس پر رحم کرے۔ اور اُسے اور آزمائش میں نہ ڈالے۔ دعا مانگتے ہوئے اُسکے آنسو نکل آتے۔ دل ہلکا ہو جاتا اور وہ پھر سے دوکان پر آبیٹھتا۔

اُس کا قرضہ اتنا بڑھ گیا تھا۔ کہ اب بازار والوں کو بھی اس کا علم ہوگیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے لالہ جے مل نے دو ایک بار اشارتاً اس سے ذکر بھی کیا۔ کہ وہ دوکان بیچ ڈالے۔ مگر وہ اُس پر رضامند نہ ہوا۔ حالانکہ یہ دوکان ایک جونک کی طرح اُس کا خون پی رہی تھی۔ مگر وہ اس امید پر اس جونک کو گلے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن یہ فاسد مادہ پی کر خود بخود ہٹ جائے گی۔

لیکن یہ بلا خود بخود ہٹنے والی نہ تھی۔ اس کے لئے اُسے بازار کے دوسرے دوکانداروں سے سبق سیکھنا چاہیئے تھا۔ جو بڑی دلیری سے کاروبار کرتے تھے۔ "یہ سویٹر ایمان سے کہتا ہوں آٹھ روپے کی خرید ہے۔ آپ صرف آٹھ آنہ نفع دے دیجئے —— اچھا آپ کی خاطر میں نفع نہ لونگا۔ آٹھ روپے دے دیجئے۔ خدا کی قسم اب اس میں بالکل گنجائش نہیں۔" اور خریدار جو رشوت، ریس، سٹہ نہ معلوم کہاں کہاں سے روپیہ لے کر آتے تھے۔ اس طرح کئے ہوئے ایمان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ اور یوں دنیا کی گاڑی چلتی چلی جا رہی تھی۔ اور بازار کی اس ریل پیل میں وہ خدا پر بھروسہ کئے بیٹھا ہوا تھا۔

ایک روز محمود اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ محمود کی بیوی بیمار تھی۔ اور وہ اسے بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے؟ اور کیا علاج بتایا ہے باتیں کرتے ہوئے وہ یونہی دوکان کے سامان کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ ایک ڈبے کو کھول کر اس نے دیکھا۔ اور حیرت سے چیخ اٹھا۔

"ارے یہ کیا؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ارے عقلمند یہ اعلیٰ درجہ کا مال ہے۔ ان جاپانی ڈبوں کو پھینکو۔ اسے امریکن یا انگلش مل کے ڈبوں میں رکھ کر بیچو"

لیکن یہ تو ...... "

بات کاٹ کر محمود نے کہا "جبھی تو میں کہوں یہ بازار بھر میں تمہیں کو کیوں نقصان ہو رہا ہے۔ ارے بھائی خالی دکان کھول دینے سے بھی کہیں کام چلتا ہے۔ عقل سے بھی تھوڑا بہت کام لینا چاہیئے"

"محمود میں بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ گاہک کو دھوکا دوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا"

محمود بڑی دیر تک اس سے بحث کرتا رہا۔ کیونکہ اُس کے نزدیک یہاں ایمانداری اور بے ایمانی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ بغیر ہوشیاری اور چالاکی کے بیوپار کرنا ناممکن ہے۔ مگر وہ نہ مانا۔ مایوس ہو کر محمود چلا گیا۔

محمود کے چلے جانے پر وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اپنی ناکامی کے سبب کو وہ خوب جانتا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ اس بازار میں ہر بار قسم کھانے کی قیمت چاندی کا ایک روپیہ ہے۔ لیکن وہ اسے اتنے سستے داموں بیچنے کے لئے تیار نہ تھا۔ دنیا اُسے بیوقوف سمجھتی ہے۔ تو سمجھا کرے۔ وہ دوکان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ مسجد کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر اپنے دل کو یقین دلایا کہ سچائی اور ایمانداری ضرور کامیاب ہو کر رہے گی ایک نہ ایک دن لوگوں کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ اُس کی دوکان پر کبھی دھوکا نہیں ہوتا۔ اور گاہک اس پر ٹوٹ پڑینگے۔ لیکن کب —— ؟ اس خیال پر اُس کا دل ڈوب جاتا۔ کتنے برسوں سے وہ اس امید پر جی رہا تھا۔ شاید صدیاں گزر گئی تھیں۔ اور وہ ہنوز انتظار میں تھا۔ کہ وہ دن کب آئیگا؟ جب صداقت فتح پائیگی شاید وہ دن کبھی نہیں آئیگا؟ وہ مایوس ہو کر سوچتا۔ کیونکہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دوست کے کہنے پر وہ ہر جمعرات کو پیر بدر دشاہ کی درگاہ پر جانے لگا۔ جن سے بڑی بڑی کرامتیں منسوب کی جاتی تھیں۔ مایوس العلاج مریض پریشان حال بے روزگار اور مقدموں میں پھنسے ہوئے لوگ سات جمعراتیں وہاں حاضری دے کر مرادیں پاتے تھے۔ وہ بھی مزار پر پانچ پیسے کے پھول چڑھا کر عود اور لوبان کی خوشبو میں بسی ہوئی مقدس فضا میں آنکھیں بند کر کے دعا مانگتا اور باہر نکل کر مزار کو دھونے کے بعد جمع کیا ہوا پانی بطور تبرک کے چکھ کے چلا آتا۔ ایک روز مجاور کی خوشامد کر کے وہ ایک بوتل بھر کر متبرک پانی لے آیا۔ اور اُسے دوکان میں ہر طرف چھڑک دیا۔ کیونکہ لالہ جے مل بھی گائے کا پیشاب اپنی دوکان میں چھڑکا کرتے تھے۔

لیکن بدر دشاہ کی کوئی کرامت آڑے نہ آئی۔ نمازیں اور دعائیں شاید درجۂ قبولیت نہ حاصل نہ کر سکیں۔ تمام سماوی قوتیں بیگانگی سے تکتی رہیں۔ گائے کے پیشاب کی بدبو بڑھتی چلی گئی۔ لالہ جے مل نے ایک تیسری دوکان کھول کر کاروبار کو اور بھی وسعت دیدی۔ انوار حسین نے بیوی کو گھر سے نکال کر ایک طوائف سے شادی کر لی۔ اور اس پر قرضخواہوں نے دعوے دائر کر دیئے۔ اور ڈگریاں لے کر اُس کی دوکان قرق کروا دی۔

ایک ایک کر کے دوکان کی چیزیں نیلام ہوتی رہیں۔ میز، کرسیاں، شوکیس، الماریاں سب نیلام ہو کر اُس کی دوکان بالکل خالی ہو گئی۔ اور سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد اُسی خالی دوکان میں کھڑے ہوئے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک بھیانک قبر میں کھڑا ہوا ہے۔ ایک ایسی قبر میں جو اُسے اُگل دینا چاہتی تھی۔ کاش وہ اُسے نگل لیتی۔ تو اُسے زندگی کے اس الم انگیز عذاب سے نجات مل جاتی۔ اس دوکان پر وہ اپنی آخری کوڑی تک لگا کر ہار گیا تھا۔ حالانکہ اخلاقی طور پر اس جنگ میں اُس کی جیت ہوئی تھی۔ اس کا خلوص اب تک بے داغ تھا۔ اس کا یقین اور اعتماد دوکان کے کاؤنٹر پر سکوں سے خرید نہ جا سکا۔ مگر اس وقت یہ نہ بتا سکتا تھا۔ کہ وہ کیا جیتا ہے؟ اور کیا ہارا ہے؟

مستقبل اُسے اپنی اُس خالی دوکان کی طرح مُنہ پھاڑے سامنے کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ کیا کریگا؟ وہ کہاں جائیگا؟ یہ سوال اُس کے ذہن کے کواڑوں کو توڑ کر اندر گھس آنا چاہتے تھے۔ تاکہ اُنہیں جواب ملے۔ اُس نے نظر اٹھا کر دوکان سے باہر دیکھا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ اور عصر کی نماز کا وقت قریب تھا۔

اُسی روز امام نے نماز پڑھاتے ہوئے جب یہ آیت پڑھی "اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ خوف سے، بھوک سے، اولاد سے اور جان و مال

کے نقصان سے۔ اور اُن لوگوں کو خوشخبری دو جو مصیبت میں بھی ثابت قدم رہے،، تو اُس کی پست ہمّت پھر سے بلند ہوگئی۔ اُسکے مردہ جسم میں پھر سے خون گردش کرنے لگا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے ایک غیبی آواز اُس سے کہہ رہی ہے۔ کہ وہ کمزوری نہ دکھائے۔ استقلال سے کام لے۔ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے جس میں کامیاب ہونے کا صِلہ اُسے ضرور ملیگا۔

اُس نے بڑے جوش سے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن کامیابی کے گروں کو جانتے ہوئے بھی جب وہ اُن پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو پھر کام کیونکر چلتا۔ ہر روز وہ گڑگڑا کر اللہ میاں سے دعائیں مانگتا۔ کہ اب اس پر رحم کیا جائے۔ مگر آزمائش سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ اُس کی بیوی کا زیور ایک ایک کر کے سب بک گیا۔ گھر کا تمام سامان آرائش ختم ہوگیا۔ اور نجات کی کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔

یورپ میں جنگ شروع ہوگئی۔ اور چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ اُسکے ساتھ کے دوکانداروں کا مال دوکان میں پڑے پڑے ہی دُگنی چوگنی قیمتوں کا ہوگیا۔ وہ بڑی حسرت سے سوچتا کہ کاش جنگ کچھ عرصہ پہلے شروع ہو جاتی۔ تو اس کا سامان جو اُسنے پونے بیچ ڈالا گیا تھا۔ اُس کے سارے قرضوں کا پورا کر دیتا۔ مگر اللہ کی یہ رحمت جو جنگ کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ اس میں اس کا کوئی حصّہ نہ تھا

ایک روز محمود سے اُس نے کہا،، بھائی تمہارے نصیب اچھے ہیں۔ دوکان پہلے ہی اچھی چلتی تھی۔ اور اب تو کیا کہنا ہے۔ گھر میں پڑا ہوا مال سونا بن گیا۔"

محمود نے کہا،، ہاں بھائی اسے اللہ کی مہربانی سمجھ جو جنگ شروع ہوگئی۔ ورنہ خواب میں بھی قیمتوں کے اتنا بڑھ جانے کا تصور نہ ہو سکتا تھا،،

اُن دولتوں کے نزدیک جنگ کی اس کے سوائے اور کوئی اہمیت نہ تھی۔ کہ اس سے چیزوں کے دام چڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ایسے ملک میں رہتے تھے۔ جہاں فساد تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ مگر جنگ نہیں ہوتی۔

محمود نے کہا،، بھیا فساد میں تو کرفیو آرڈر نافذ ہو جاتا ہے۔ دوکانیں بند رکھنی پڑتی ہیں۔ اور نقصان کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم ہندستانیوں کو خدا کی قسم کوئی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا۔ ایک یورپ والوں کو دیکھو۔ جنگ یہ لوگ اسلئے لڑتے ہیں۔ کہ دنیا بھر کی دولت میں اضافہ ہو جائے۔

اور اُس نے سوچا کہ محمود کا یہ اندازہ کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ یورپ والے اسی لئے جنگ کرتے ہیں۔ کہ دنیا بھر کی دولت میں اضافہ ہو جائے لیکن یہ اضافہ صرف اُن کے ہاں ہوتا تھا۔ جن کے پاس پہلے ہی سے دولت تھی۔ اُن کے سامان کی قیمتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اُن کی تجارت بھی ترقی کر رہی تھی۔ مگر اس بڑھتی اور پھیلتی ہوئی دولت میں اُس جیسے مفلس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ وہ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح بساط سے الگ ہو کر اس شیطانی کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں حصّہ لینے کے لئے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کے پاس نہ تھے۔ اب تو اُسے اور اُسکے بیوی بچوں کو ایک وقت کا کھانا بھی مشکل سے نصیب ہوتا تھا۔

آخر کار اُس کے ایک دوست نے ایک جگہ اُس کی نوکری کا بندوبست کرا دیا۔ لالہ گردھاری لال نے بڑے بازار میں کپڑوں کی ایک دوکان کھولی تھی۔ کیونکہ کپڑے کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ بدیسی ملکوں کا مال آنا بند ہوگیا تھا۔ اور اب ہندستانی کپڑے کی بہت مانگ تھی۔ لالہ جی کے مل کے مالکوں سے گہرے تعلقات تھے۔ اس لئے اُنہیں دوکان کے لئے مال آسانی سے مل سکتا تھا۔ اُنھوں نے جب یہ سُنا۔ کہ پہلے اُس کی اپنی دوکان تھی۔ مگر اب نصیب کے ہاتھوں پریشان ہے تو وہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ اور اُنھوں نے کہا،، آپ کل ہی سے آجائیے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت لالہ جی نے اُسے بلا کر کہا،، میں تو سمجھتا تھا۔ کہ آپ دوکان کے کام کاج سے واقف ہونگے۔ مگر آپ تو بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ارے بھائی جب گاہک کپڑا مانگے۔ تو اُسے آٹھ آنہ گز کا کپڑا بتایئے۔ بڑھیا مانگے تو نو آنہ گز والا بتایئے۔ اور بڑھیا مانگے تو چودہ آنہ گز والے کپڑے کا سوا روپیہ گز کر کے بتایئے۔ گاہک ایک روپیہ میں وہ کپڑا خوشی سے لے جائیگا۔ جیسا گاہک دیکھئے ویسا کام کیجئے۔ آپ دوکاندار رہ چکے ہیں اور دوکانداری نہیں جانتے،،

اُس نے کہا،، بہت اچھا۔ میں ذرا نماز پڑھ آؤں"

مسجد سے وہ سیدھا گھر چلا آیا۔ جب اُس نے اپنی دوکان اجاڑ دی۔ مگر دھوکے بازی نہ کی۔ تو کیا اب لالہ جی کے لئے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے

(بقیہ صفحہ ۸۸)

نہیں وہ ایسا نہیں کریگا۔ وہ اس امتحان میں ثابت قدم رہے گا۔

کچھ دنوں بعد اس کا بڑا لڑکا بیمار ہوگیا۔ جس گھر میں کھانے کے لئے روٹی بھی میسر نہ ہوتی ہو۔ وہاں بیمار کا علاج کہاں سے ہوگا۔ لڑکے کی حالت۔ روز بروز دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ مرض آہستہ آہستہ اس پر غلبہ پانے لگا۔ اپنے بچے کو یوں موت و زیست کی کشمکش میں دیکھ کر اس کی صابر و شاکر بیوی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے فاقے خاموشی سے برداشت کئے تھے۔ مگر اپنے بچے کو وہ یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس نے محمود کو بلوا بھیجا۔ اور رو رو کر اس سے یہ سب ماجرا بیان کیا۔

محمود خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ وہ اپنے دوست کی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بھی خوب جانتا تھا۔ کہ اس کی ان کمزوریوں میں کتنی قوت ہے۔ اور یہ قوت اُسے اکثر متعجب کر دیتی تھی۔ لیکن اب کی بار اُسے یہ موقع ملا تھا۔ جب کہ وہ اپنے دوست کی مدد کر سکتا تھا۔ بچے کی دوائی کے لئے روپیے کر نہیں۔ بلکہ اپنے دوست کو زندہ رہنا سکھا کر وہ چاہتا تھا۔ کہ اس کا دوست اس دنیا میں رہنے کے گُر سیکھ جائے۔ اس لئے وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اُس کے پاس بڑی کافی تعداد میں نہایت نفیس قسم کے جاپانی رومال ہیں۔ جن پر کوئی مہر لگی ہوئی نہیں ہے۔ چار چار آنہ میں یہ رومال اُسے گھر پڑا ہے وہ اس سے کوئی نفع نہیں لے گا۔ اگر یہ رومال امریکن فوجی کیمپ میں جا کر بیچے جائیں۔ تو امریکی سپاہی بڑی خوشی سے ایک ایک روپے میں رومال خرید لیںگے۔ یوں روزگار کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ اور اللہ اپنا فضل کرے گا۔ لیکن ہاں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر کوئی فوجی یہ پوچھے کہ یہ رومال کہاں کے بنے ہوئے ہیں۔ تو کہہ دیا جائے کہ امریکہ کے ہیں۔ ورنہ اس وقت امریکہ اور جاپان میں لڑائی ہو رہی ہے۔ جاپانی کا نام سنتے ہی کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔"

محمود تو چلا گیا۔ لیکن اُسے ایک گہری سوچ میں چھوڑ گیا۔ اُسے ایک بار پھر یاد آگیا۔ کہ اس کی آزمائش ابھی تک جاری ہے۔ کیا یہ امتحان کبھی ختم نہ ہوگا یہ کیسا امتحان ہے جو وہ دے رہا ہے! جس کی بازپرس اُسے خود اپنے آپ کو دینی پڑتی ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہاں یہ اُسی کا گھر تھا۔ یہ سامنے اُسی کی بیوی تھی۔ جسے فاقوں نے لاغر و نحیف کر دیا تھا۔ یہ پلنگ پر لیٹا ہوا اس ہی کا بیٹا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ اپنے بچوں سے محبت تھی۔ وہ انہیں اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی یہ نہ جانتا تھا۔ کہ اس کی روح کس کشمکش میں مبتلا ہے؟

محمود کے نوکر نے آواز دی اور چار درجن رومال دے کر چلا گیا۔ بیوی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہ رومال اُس کے آگے بڑھائے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے والی عورت کیا جانتی تھی۔ کہ امریکہ کہاں ہے؟ اور جاپان کدھر ہے؟ یا اُسکے خاوند کے دل و دماغ میں کونسی جنگ ہو رہی ہے۔ وہ تو اتنا جانتی تھی۔ کہ اس کا بچہ بیمار ہے۔ اور اس کا علاج ہونا چاہیئے۔

اس نے رومال اٹھا لئے۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ وہی بیوی تھی۔ جس نے آج سے پہلے اس سے عمر بھر میں کوئی فرمائش نہ کی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بیوی کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی یاس تھی۔ کتنی التجا تھی۔ وہ آنکھیں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں جسے بیان کرنے کے لئے الفاظ اُن کے پاس نہ تھے۔ اور جسے واضح طور پر شاید وہ خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اس پیام کو محسوس کر سکتا تھا۔ اُن آنکھوں نے اُس کی زبان پر قفل لگا دیئے۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ رومالوں کا ڈبہ لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ زندگی کا دوراہہ شاید آج پہلی بار اتنا بادگر ہو کر اسے نظر آنے لگا۔ ایک راستہ دائیں جانب مڑتا تھا اور ایک راستہ بائیں جانب وہ دل ہی دل میں خوب جانتا تھا۔ کہ اُسے کس طرف مڑنا چاہیئے۔ اس نے ہمیشہ بلا کسی جھجک اور تامل کے اپنے راستہ پہ قدم اٹھا دیا تھا۔ مگر اب کی بار وہ آنکھیں اس کے سامنے آجاتیں۔ اُف ان آنکھوں میں کتنی کرب ناک اذیت تھی۔ وہ آنکھیں اسے دھکیل کر اس راستہ پر ایک جانب موڑنا چاہتی تھیں۔ بلکہ شاید کائنات کی ساری قوتیں متحد ہو کر اُسے ایک طرف دھکیل رہی تھیں۔ ایک جانب موڑ دینا چاہتی تھیں۔ اور ان قوتوں کے مقابلے میں اب وہ بے بس ہو چکا تھا۔ کیا ان دو راستوں کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں ہے؟ اُس نے سوچا۔ لیکن وہاں اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ زندگی محض ایک دوراہا ہے۔ جس پر چلنے والا انسان مجبور ہوتا ہے۔ کہ ان دو راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو اپنے لئے منتخب کرلے۔ وہ اپنی راہ منتخب کر چکا تھا۔ مگر آج انجانی قوتیں اسے دھکیل رہی تھیں

(کشمیری لال ذاکر)

کچّی دیوار

کردار :-

(۱) ڈاکٹر بھاٹیہ ———— ہسپتال کا سول سرجن

(۲) ستیش ———— ہسپتال کا ایک ڈاکٹر

(۳) نرس ———— ہسپتال کی ایک نرس

(۴) پُشپا ———— زخمی کی بیوی

(۵) بڑھیا ———— زخمی کی ماں

پہلا منظر : (ہسپتال کا ایک کمرہ) حادثے میں زخمی ہوئے لوگوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد ڈاکٹر بھاٹیہ اور ڈاکٹر ستیش گفتگو کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر بھاٹیہ سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں چھوڑ کر اُنہیں آپس میں خلط ملط ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال کی ہے۔ اور اسکے تیکھے نقوش سے لطیف احساس کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر ستیش کی عمر لگ بھگ پچیس برس کی ہے۔ اسکے چہرے سے ناتجربہ کاری کا اظہار ہوتا ہے۔ اُسے ڈاکٹر بنے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ اور وہ ڈاکٹر بھاٹیہ کی شخصیت سے خاص طور پہ متاثر ہے۔ اس حادثے نے اس کے دل پر خاص اثر ڈالا ہے۔ اس کی آواز میں حیرت اور خوف کی آمیزش ہے۔

ستیش :- میں نے تو زندگی میں ایسا بھیانک حادثہ کبھی نہیں دیکھا۔

بھاٹیہ : (حیرت سے) کیا کہا۔ ایسا حادثہ کبھی تمہاری نظر سے نہیں گزرا۔

ستیش :- جی نہیں۔

بھاٹیہ :- اس کا مطلب ہے، تم اپنی زندگی کے محفوظ خول سے باہر نہیں نکلے۔ تم نے اپنے آنگن کی دیوار کو پھلانگ کر اس کے باہر رونما ہونے والے واقعات کا مطالعہ نہیں کیا۔

ستیش :- بس ایسا ہی سمجھ لیجئے۔

بھاٹیہ :- میرے دوست۔ زندگی خود ایک عظیم حادثہ ہے۔ یہ دنیا جس پر ہم رینگ رہے ہیں۔ ایک حادثہ کی ہی تو تخلیق ہے۔ اور موت شاید آخری حادثہ ہے۔ جو انسان کو پیش آسکتا ہے۔

ستیش :- مگر بعض اوقات موت کو بھی اپنی تکمیل کے لئے کسی حادثہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بھاٹیہ :- ہاں۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب موت پے در پے شکستیں کھا کر اوچھے وار پر اتر آتی ہے۔ نہیں تو میدان جنگ میں دن رات

دنیا زخموں کی زد میں رہ کر بھی بچ جانیوالا انسان، زندگی اور موت کی
مخلوط حدود پر چٹان کی طرح مضبوط کھڑا سپاہی۔ خون کی ابلتی ہوئی
ندی میں بغیر ہچکچاہٹ کے غوطہ لگا جانیوالا آدمی، فتح کے پرچم لہراتا
اپنے وطن لوٹے۔ اور لاری کے درخت کے ساتھ ٹکرا جانے سے
موت کے مضبوط جبڑوں میں پس جائے۔ ایسی موت۔ موت کی شکست ہے

ستیش :۔ آپ کا اشارہ شاید اُس فوجی سپاہی کی طرف ہے۔ جس کے
زخموں میں آپ ابھی ٹانکے لگا کر آئے ہیں۔

بھاٹیہ :۔ ہاں اور جس کے بچنے کی مجھے بالکل امید نہیں۔ دیکھا کیسے
ہنس ہنس کے موت کا مقابلہ کر رہا ہے۔ موت اُس پر بھیانک
وار کر رہی ہے۔ اور اُس کے پاس صرف ایک ڈھال ہے۔ خاموشی
کتنی مضبوط ہے اُس کی یہ ڈھال۔

ستیش :۔ اور اُس کے دوسرے ساتھی ہیں۔ کہ چیخ کر ہسپتال سر پر
اٹھا رہے ہیں۔

بھاٹیہ :۔ اُنہوں نے موت کو قریب سے نہیں دیکھا۔ جنہوں نے موت
کو قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اُسے زندگی ہی کا روپ سمجھتے ہیں۔

ستیش :۔ اور تو سب زخمیوں نے اپنے اپنے گھر اطلاع بھجوانے کی
درخواست کی ہے۔ صرف وہ فوجی سپاہی اب تک اپنی ضد پر اڑا
ہوا ہے۔

بھاٹیہ :۔ کیا کہتا ہے وہ۔

ستیش :۔ ہر زخمی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر منت کی ہے۔ کہ اُس کے متعلقین
کو جلد بلایا جائے۔ لیکن وہ ہے کہ خود پہلو بھی نہیں بدل سکتا۔
بول بھی نہیں سکتا۔ زیادہ عرصہ آنکھیں بھی کھلی نہیں رکھ سکتا۔ اور
کہتا ہے۔ اُس کے گھر اُس کی موت کی خبر نہ دی جائے۔ وہ ابھی سے
موت کا تصور کر رہا ہے۔ جیسے اُسے یقین ہے۔ کہ وہ اب بچ
نہیں سکے گا۔

بھاٹیہ :۔ اس کا یہ یقین بہت حد تک درست ہے۔ مگر وہ اپنے گھر اطلاع
کیوں نہیں بھجوانے دیتا۔

ستیش :۔ میں نے اُس سے بارہا پوچھا۔

بھاٹیہ :۔ اور اُس نے کچھ نہیں بتایا۔

ستیش :۔ اُس نے ایک وجہ بتائی ہے۔ اُس کی بیوی دق کی آخری
منزل پر ہے۔ اُسے دھڑکا ہے کہ اُس کی موت کی خبر اُس کی
بیوی کو زندہ نہ رہنے دیگی۔

بھاٹیہ :۔ اور خود وہ بغیر کسی سہارے کے موت کے آخری وار سہتا
رہے گا۔ مرتے وقت اُسے اپنے کسی عزیز انسان کی قربت کی
حسرت نہیں۔ وہ زندگی کے اس صحرا سے یوں گزر جانا چاہتا ہے
کہ اُس کے نقش پا کو بھی کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ یوں اس دنیا سے اُٹھ
جانا چاہتا ہے۔ کہ کوئی اُس کی زندگی پر دو ایک آنسو بھی نہ بہائے
کتنا غیور انسان ہے وہ ——

ستیش :۔ بے شک۔

بھاٹیہ :۔ ایسے انسان موت کا منہ چڑاتے ہیں۔ اور موت انہیں مکمل طور پر
مٹانے سے پہلے جہنم کے شعلوں سے جھلستی اور زہر آلود بھالوں سے
چھیدتی ہے۔ اور مٹا چکنے کے بعد اُن کی خاک کے ایک ایک ذرے
کو بکھیرنے کے لئے آندھیاں اٹھاتی اور

ستیش :۔ آپ ہی فرمائیے۔ اب اس کا کیا کیا جائے۔

بھاٹیہ :۔ دیکھو سوچکر، دو نرسوں کی ڈیوٹی لگا دو۔ وہ رات بھر
اُس زخمی کے قریب رہیں اور اُسے ہر ممکن طریقے سے آرام
پہنچانے کی کوشش کریں۔ اور اگر اُس کی حالت زیادہ بگڑ جائے
تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔ آج رات کس کی ڈیوٹی ہے؟

ستیش :۔ جی میری ہے۔

بھاٹیہ :۔ تو ٹھیک ہے۔ ہمیں اس زخمی کو مرنے سے پہلے یہ یقین
دلانا ہے کہ وہ ایک لاوارث انسان نہیں۔ جس کی دیکھ بھال
کرنے والا کوئی نہیں۔ اُسے نہایت نرمی اور سلیقے سے موت
کے ہاتھ سونپنا ہے۔

ستیش :۔ آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟

بھاٹیہ :۔ اس لئے کہ وہ موت کا بہادروں کی طرح مقابلہ کر رہا ہے
وہ آنے والے بھیانک لمحوں کا خیال کر کے سینہ نہیں پیٹ
رہا۔ بلکہ مردانہ وار سہہ رہا ہے اُس کی چوٹیں۔

ستیش :۔ میں نے آج پہلی بار ایک رات میں سات انسان مرتے

دیکھے ہیں۔

بھاٹیہ:۔ تمہیں ڈاکٹر بنے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لئے۔ ورنہ ایک رات میں کئی کئی خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ کئی بستے ہوئے شہر خاک کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ بیسیوں عورتوں کے سہاگ لٹ جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔

ستیش:۔ صبح تو پوسٹ مارٹم میں بھی بڑی مصیبت ہوگی۔

بھاٹیہ:۔ وہ تو ہوگی ہی۔

ستیش:۔ اس فوجی سمیت آٹھ لاشیں ہو جائیں گی۔

بھاٹیہ:۔ ابھی تو وہ زندہ ہے کیوں سوچ رہے ہو۔ اس کے پوسٹ مارٹم کے متعلق۔

ستیش:۔ لیکن وہ بارہ بجے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔

بھاٹیہ:۔ اگر وہ مر گیا تو اس کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوگا۔

ستیش:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اس کا رزلٹ کیسے دیں گے۔

بھاٹیہ (ذرا غصہ سے) اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تم پر نہیں۔ میں پوسٹ مارٹم کر کے اس کی لاش کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایک غیور انسان ہے۔ میں نے تمہارے ذمے ایک اہم کام لگایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے اچھی طرح سرانجام دو گے

(ڈاکٹر بھاٹیہ چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر:۔

ہسپتال کا کامن وارڈ۔ کئی چارپائیاں بچھی ہیں ستیش اور نرس باتیں کر رہے ہیں۔ نرس کی عمر پینتالیس کے قریب ہے اس کی آنکھوں میں جیسے ہسپتال کی فضا کا تمام کرب اور درد سمٹ آیا ہے۔ زخمی کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو رہی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ جو فرض اس کے ذمے لگایا ہے۔ اسے وہ پوری طرح ادا نہیں کر رہی۔ اسے ڈاکٹر بھاٹیہ سے خاص انس اور عقیدت ہے۔

نرس:۔ زخمی کا خون بند نہیں ہو رہا۔ جیسے اس کی نس نس کٹ گئی ہو۔

ستیش:۔ اسے پوری طرح ہوش بھی تو نہیں۔ کیوں نہ انجکشن دے دیں۔ نیند تو آ جائے گی۔ سکون سے مر تو سکے گا بیچارا۔ ورنہ زندگی کے چند گھنٹے تڑپ تڑپ کر گزارے گا۔

نرس:۔ ہاں یہ بہتر ہے۔

ستیش:۔ تو تم خود ہی کرو سب سامان تیار۔

ستیش:۔ ہاں بس ایسے ہی ذرا آہستہ سے تو پہلو بدل لو۔ (وقفہ)

(مریض اسی طرح پڑا رہتا ہے)

نرس:۔ دی کیس از ویری سیریس۔ وہ تو پہلو بھی نہیں بدلتا۔

ستیش:۔ مگر اب تو دو بج رہے ہیں۔ کیا کیا جائے۔

نرس:۔ صاحب کو ہی بلوا لو۔ اس کی تسلی ہو جائے گی۔

ستیش:۔ ہوں۔ تو فون کرتا ہوں (فون کرتا ہے) ڈاکٹر صاحب زخمی کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو خود تشریف لے آئیں۔ (وقفہ) انجکشن تو میں نے دیدیا ہے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ (وقفہ) اچھا تو آپ آ رہے ہیں (وقفہ) جی ہاں نرس بھی یہیں ہے۔

نرس:۔ کتنا عجیب آدمی ہے یہ ڈاکٹر۔

ستیش:۔ مگر اس نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔

نرس:۔ سنا ہے۔ جب یہ ولایت گیا۔ تو اس کی شادی ایک لڑکی سے طے ہو چکی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں اس کی منگیتر کے خط بھی راستے سے اڑا لئے جاتے۔ کتنا عرصہ اس کی منگیتر کو ڈاکٹر کے متعلق کوئی خبر نہ ملی۔ بہت انتظار کے بعد والدین نے لڑکی کی شادی کسی اور جگہ کر دی۔

ستیش:۔ لڑکی اس پر راضی تھی

نرس:۔ یہ تو میں نہیں جانتی۔ مگر جس روز اس کی شادی ہوئی اس سے اگلے دن ڈاکٹر بھاٹیہ کراچی پہنچے۔

ستیش:۔ اُف۔ گریٹ ٹریجڈی۔ اس کے بعد۔

نرس:۔ اسے آخر سب حالات سے آگاہ کر دیا گیا۔ اسے بہت صدمہ ہوا۔ اس نے خواہش ظاہر کی۔ کہ وہ اس عورت سے ایک بار ملنا چاہتا ہے لیکن اس کی اس خواہش کو بھی ٹھکرا دیا گیا۔

ستیش:۔ کیوں۔

نرس:۔ شاید عورت کے خاوند کو خود پر اعتماد نہ تھا۔

ستیش :۔ ڈاکٹر نے کہیں اور شادی کیوں نہ کر لی۔

نرس :۔ اُسے اچھے اچھے گھرانوں سے رشتے آئے۔ لیکن اُس نے ٹھکرا دیئے۔ اُس نے اپنی الجھی ہوئی زندگی کو سنوارنے کی کوشش ہی نہ کی۔

ستیش :۔ اور جب سے۔ (فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ڈاکٹر بھاٹیہ کامن وارڈ میں داخل ہو جاتا ہے)

بھاٹیہ :۔ (زخمی کو دیکھ کر) اب تو یہ جا رہا ہے۔

ستیش :۔ (سادگی سے) کہاں۔

بھاٹیہ :۔ (جذباتی انداز میں) فضا کی راہوں پر جہاں سے کوئی انسان واپس نہیں آتا۔ ختم ہو گئی بیچارے کی کشمکش۔ ٹوٹ گئی غریب کی آس۔

نرس :۔ ایسا ہی ہے۔ یہ سنا ڈاکٹر۔

بھاٹیہ :۔ (ادھر توجہ نہ دیتے ہوئے) اس کی نبض یوں ڈوب رہی ہے۔ جیسے کوئی کشتی بھنور میں پھنس کر ڈوبے ابھرے اور پھر ڈوب جائے۔ جیسے ایک شمع بجھے بھڑکے اور پھر اندھیاری میں غرق ہو جائے۔ (نرس سے مخاطب ہو کر) ڈال دو اس کے جسم پر چادر شاید گلا گھونٹنے سے پہلے موت اسے کچھ کہنا ہو۔ کوئی نہ سُنے موت کی سرگوشیاں۔

(نرس آگے بڑھ کر اُس پر چادر ڈال دیتی ہے)

نرس :۔ تو آپ آرام کیجئے۔ ہم یہیں ہیں۔

بھاٹیہ :۔ تم بھی اب یہاں رہ کر کیا کرو گی۔ وہ تو کسی کے بھی وجود سے بے نیاز ہے۔ ہاں اور دوسری لاشوں کے پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے تمہیں اسکے جلانے کا انتظام کرنا ہو گا ستیش۔

ستیش :۔ ہو جائیگا صاحب۔

بھاٹیہ (نرس سے) تم ذرا میرے ساتھ چل سکتی ہو۔

نرس :۔ کیوں نہیں۔

بھاٹیہ :۔ تو آؤ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ ستیش تم نے اس سپاہی کا سامان میرے کوارٹر میں بھجوا دیا تھا۔

ستیش :۔ جی صرف ایک ٹرنک مل سکا تھا۔ وہ بھجوا دیا تھا۔ لاری کا بیشتر سامان تو بالکل جل گیا تھا۔

(ڈاکٹر بھاٹیہ اور نرس کامن وارڈ سے باہر نکل جاتے ہیں)

تیسرا منظر :۔

ڈاکٹر بھاٹیہ کا کوارٹر جو ہسپتال کے ہی ایک کونے میں واقع ہے۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر ہلکا سا شیڈ ہے فرش پر نہایت عمدہ قالین بچھا ہے۔ خوبصورت ریشمی پردے کھڑکیوں اور دروازوں سے لٹک رہے ہیں۔ کمرے میں قیمتی فرنیچر سلیقے سے لگا ہے۔ کمرے کے ماحول سے کچھ یوں نظر آتا ہے۔ کہ اس کی ترتیب میں کسی عورت کا ہاتھ نہیں، ڈاکٹر بھاٹیہ کی مجرد زندگی کی گہری چھاپ اس پر مرتسم ہے۔ ڈاکٹر ادھ جلے سگرٹ کو ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے صوفے میں دھنس جاتا ہے۔ نرس بھی قریب ہی بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ لمحے ایش ٹرے سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو گھورتے رہنے کے بعد وہ جذباتی انداز میں گفتگو شروع کرتا ہے

بھاٹیہ :۔ جب میں اس ہسپتال میں آیا تھا۔ جب سے تم مجھے جانتی ہو تم میری زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے بہت حد تک واقف ہو۔ تم نے جو خلوص اور ہمدردی مجھ سے [illegible] اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔

نرس :۔ یہ میرا فرض تھا۔ تم نے اپنے حسن اخلاق اور قابلیت سے ہر دلعزیزی حاصل کی ہے۔

بھاٹیہ :۔ جس زخمی سپاہی کو تم ابھی ابھی آرام سے موت کی نیند سو جانے کو چھوڑ آئی ہو۔ اس نے جانے کیوں میرے ماضی کے تار توڑ دینے کی حد تک مرتعش کر دیئے ہیں۔ میں نہیں جانتا صرف ایک نامکمل سے فقرے نے مجھے کیوں اس کے اتنا قریب کر دیا ہے "میرے گھر میری عورت کو بھی خبر نہ دی جائے" کتنا سکون تھا۔ اُس کے چہرے پر جیسے وہ موت سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔

نرس :۔ دکھا ہوا دل کئی بار ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے بھی تڑپ اُٹھتا ہے۔

بھاٹیہ :۔ میں اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دونگا لیکن

شخصیت کا پوسٹ مارٹم ضرور کرونگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کن کن عناصر سے ترتیب میں آئی تھی۔ اس کے کیرکٹر میں ضرور کوئی غیر معمولی طور پر روشن نقطہ ہے۔ جس نے میرے سوئے ہوئے احساس کو جگا دیا ہے۔

نرس:۔ اب تو مر گیا بے چارا۔ تمہیں کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کے متعلق۔

بھاٹیہ:۔ اسکا سامان میرے پاس ہے۔ تم اسکے ٹرنک کو کھولو۔ اُس کی چیزوں کو ایک ایک کر کے بغور دیکھو۔ تم اسکے ذہنی ارتقا اور مذاق کا اندازہ کر سکو گی۔

نرس:۔ مگر وہ تو ایک عام سپاہی تھا۔ اُن ہزاروں سپاہیوں میں سے ایک جو جنگِ عالمگیر میں بھوک سے تنگ آکر توپوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ایسے سپاہی جو بنگال کے قحط کی پیداوار ہیں۔

بھاٹیہ:۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ لیکن نتیجہ غلط۔ ایک با مذاق اور غیور انسان مرے گا بھی تو شان اور سلیقے سے۔ اُس کی غورت زندگی میں نکھار لاتی ہے۔ اس میں سُندرتا بھرتی ہے۔ اسے ابدیت بخشتی ہے۔

نرس:۔ میں بعض دفعہ سوچتی ہوں کہ تم اس سے مختلف اور بہتر زندگی بھی گزار سکتے تھے۔

بھاٹیہ:۔ (قہقہہ لگا کر) مختلف تو یقیناً گذار سکتا تھا۔ لیکن بہتر شاید نہیں۔

نرس:۔ اگر تم شادی کر لیتے۔

بھاٹیہ:۔ (بات کاٹ کر) شادی کر لیتا تو میرے گھر میں یہ ویرانی اور خاموشی نہ ہوتی۔ یہاں ایک ہنگامہ رہتا۔ ایک ہلچل ہوتی ایک حرکت ہوتی۔ لیکن میرا ذہن بیاہتا زندگی میں وہ آسودگی اور اطمینان حاصل نہ کر سکتا۔ جو مجھے اب حاصل ہے۔ میری ازدواجی زندگی شاید کبھی مجھے خود کشی کے لئے اُکساتی اور میں شاید اب کی طرح ذہن کی اس باغی قوت کو دبا نہ سکتا۔ میں شاید اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں مار ڈالتا۔ اور تمہیں میری لاش کے پوسٹ مارٹم پر دکھ ہوتا۔ مگر تم چھوڑو ان باتوں کو۔ دوسرے کمرے سے سپاہی کا ٹرنک اُٹھا لاؤ۔

نرس:۔ (ٹرنک کو رکھتے ہوئے) یہی ہے نا۔

بھاٹیہ:۔ ہاں یہی ہے۔ دیکھا ٹرنک کے کالے روغن میں یہ نام کیسے لگتا ہے۔ حرفوں کے لکھنے میں کیسا مدھم شیڈ استعمال کیا گیا ہے۔ کتنی ... ہوگی اس کے سبھاؤ میں۔ نام کے حروف بجھی بجھی روشنی سے یوں چمک رہے ہیں۔ جیسے فنا کی ... ست میں زندگی کی آخری روشن لکیر۔

نرس:۔ (آہ بھر کر) قدرت کتنی بے انصاف ہے۔

بھاٹیہ:۔ (مطلب نہ سمجھتے ہوئے) یوں نہ کہو نرس۔ قدرت کائنات کی اعلیٰ ترین منصف ہے (رُک کر) اس قفل کی چابی تو میرے پاس نہیں اسے توڑ ہی دو۔ لیکن آہستہ سے توڑنا اسے۔ اس میں ایک مردہ انسان کا ماضی ہے۔ ہمیں اسکے ماضی کو صرف دیکھنا ہے۔ جھنجھوڑ کر۔ ٹھوکے دیکر۔ زندہ نہیں کرنا۔

(نرس آہستہ آہستہ قفل توڑنے لگتی ہے)

نرس:۔ قفل تو ٹوٹ گیا۔

بھاٹیہ:۔ اب اس ٹرنک کو کھولو۔ اس میں پڑی چیزوں کو ایک ایک کر کے مجھے دکھاتی جاؤ۔ اور ایک طرف رکھتی جاؤ۔ سب سے پہلے ٹرنک کا شیلف خالی کرو۔

نرس:۔ (شیلف میں سے کچھ کاغذ نکالتے ہوئے) یہ شاید خطوں کا ایک پلندہ ہے۔

بھاٹیہ:۔ گن کے دیکھو کتنے خط ہیں یہ۔

نرس:۔ (گن کر) آٹھ

بھاٹیہ:۔ کس زبان میں لکھے ہیں۔

نرس:۔ ہندی ہیں۔

بھاٹیہ:۔ تو لاؤ میں خود انہیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نرس:۔ یہ کچھ نسخے بھی ہیں۔

بھاٹیہ:۔ (نسخوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے) بیچارہ ہر فوجی ڈاکٹر سے اپنی بیوی کے لئے نسخے لکھوا تا رہا۔ کیلشیم کے انجکشن۔ کیلشیم کی گولیاں۔ سب کچھ رہ گیا یہیں۔

ڈرامے کی تکمیل سے پہلے اسٹیج گہرے اندھیرے میں ڈوب گئی وہ اپنی بیوی کی فنا کی طرف لڑھکتی ہوئی زندگی کے لئے کوئی دوا حاصل نہ کر سکا۔

نرس :۔ پہلے خطوں کو دیکھ لو ڈاکٹر، حالات کو سمجھنے میں شاید یہ زیادہ مدد کر سکیں۔

بھاٹیہ :۔ ایک ہندوستانی عورت اپنے خاوند کی جدائی میں کتنی پریشان ہوا کرتی ہے (اچانک چونک کر) کسی اور سے خط لکھوایا گیا ہے شاید۔ کتنی بدمذاقی سے بچہ پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ جذبات کو بالکل کوئی دخل ہی نہیں اس میں (غمناک لہجہ) اور اب ڈرامہ تیزی سے بڑھنے لگا ہے۔ اپنے انجام کی طرف۔ پشپا دیوی کو ہلکا ہلکا بخار ہونے لگا ہے۔ روپے کی ضرورت ہے اور نرس اب یہ بخار دق میں بدل گیا ہے۔ اور یہ لو آخری خط۔ خیراتی لال کو جلد پہونچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

نرس :۔ خط کی تاریخ کیا ہے۔

بھاٹیہ :۔ (پڑھ کر) ۱۲ر اپریل۔

نرس :۔ اور آج اٹھارہ جون ہے۔ پورے دو ماہ کے بعد اُس نے اپنے گھر پہونچنا تھا۔

بھاٹیہ :۔ بے چارہ رخصت کے لئے پریشان ہوتا رہا ہوگا۔ اُس کی بیوی موت کے عمیق غار میں گرنے کو ہے۔ اور وہ اُس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنی جاں بلب بیوی کے منہ میں دو بوند پانی ڈالنے کی مہلت نہیں دیجاتی۔ دن رات انسانی جسموں سے کھلواڑ کرنے والے لوگ انسانی زندگی کی اہمیت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

نرس :۔ شاید اُس کے وہاں پہونچنے تک اُس کی بیوی مر چکی ہوتی

بھاٹیہ :۔ ہاں اور اُسے ایک یتیم بچے کو اپنی گود میں لے کر ماں اور باپ دونوں کے فرائض سرانجام دینا پڑتے۔ اُس کے گھر پہونچنے تک آنچل کی اوٹ میں سلگتا ہوا چراغ شاید صبح کے انتظار میں تھک کر سو گیا ہوتا۔ اُسے صرف دیئے کے ٹکڑوں کو سمیٹنا ہوتا۔ اور دق سے پگھلی ہوئی ہڈیوں کو گنگا میں بہا کر دوبارہ برما کے محاذ پر کسی سنگین چٹان کا سہارا لینا پڑتا۔

نرس :۔ مرتے وقت اپنی بیوی کی موت کا دھڑکا شاید صرف ایک فریب تھا۔

بھاٹیہ :۔ قدرت کا المناک مذاق۔

نرس :۔ (چیزوں کو باہر نکالتے ہوئے، اب تو صرف سپاہی کے کپڑے رہ گئے ہیں اور کچھ نہیں۔

(کوئی چیز فرش پر گرتی ہے)

بھاٹیہ :۔ (حیرت سے) ہیں یہ کیا گرا۔ ایک چوڑی۔ اس کوٹ کی تہ کو الٹو۔ اس میں ضرور ایک اور چوڑی ہوگی۔

نرس : (تہہ کو الٹتے ہوئے) یہ رہی دوسری چوڑی۔

بھاٹیہ :۔ میں بس یہیں پہونچنا چاہتا تھا۔ یہ تھا زخمی کی زندگی کا وہ روشن نقطہ جس نے میرے بدلے ہوئے احساس کو جگا دیا ہے۔ وہ زندگی کے تخریبی ماحول میں سانس لیتے ہوئے بھی اپنے دل میں تخلیق کا جذبہ لئے ہوئے تھا۔ سونے کی یہ چوڑیاں ایک خراج ہے۔ جو اس کی محبت حسن کے حضور میں پیش کرنا چاہتی تھی۔ تم کیوں جھینپ رہی ہو نرس۔ تم نے شاید پہلی بار میرے منہ سے یہ فقرہ سنا ہے۔ لیکن میرے تحت الشعور کی گہرائیوں میں یہ الفاظ کئی بار گونجے ہیں۔ میں نے اُن کی گونجوں کو رات کی طویل تنہائیوں میں اکثر سنا ہے۔ سنا ہے اور ماضی کے بھاری چٹان کو قہقہے لگاتے دیکھا ہے۔

نرس :۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر

بھاٹیہ :۔ کچھ نہیں نرس۔ (جذباتی انداز میں) یہ دو بانکیں دو دائرے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے بالکل منطبق ہیں۔ یہ دو روحیں ہیں۔ جن کی بناوٹ اور گڑھن ایک جیسی ہے۔ یہ دو شمعیں ہیں جن سے ایک سہاگن کی زندگی جگمگا سکتی ہے اور اب ان دائروں میں سے ایک دائرہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایک روح باغی ہو گئی ہے۔ اور شمعیں بجھ گئی ہیں۔

نرس :۔ شاید یہ دوسرا دائرہ بھی ٹوٹ گیا ہو۔ شاید دوسری روح بھی اس دنیا سے بغاوت کر چکی ہو۔ اور شاید دونوں نے پھر آپس میں سمجھوتہ کر لیا ہو۔

بھاٹیہ:۔ یہ بات ایک عام ہندوستانی عورت کے توہم پرست دماغ کی تخلیق ہے۔ ہم جیزلین کو زندگی کا مرکز سمجھتے ہیں۔ جو لوگ زندگی میں ایک دوسرے سے قطبین کی سی دوری پر رہتے ہیں۔ انہیں موت کے بعد ایک ہو جانے کا یقین دلایا جاتا ہے۔

(ایک قہقہہ لگایا جاتا ہے)

نرس:۔ مجھے خوف آ رہا ہے تمہارے قہقہے سے۔

بھاٹیہ:۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہتھیاروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آواز نہیں۔ ٹوٹ کر زمین پر گرنے کی آواز ہے۔ یہ کسی فتح کی نہیں شکست کی گونج ہے۔

نرس:۔ چپ رہو ڈاکٹر۔ بھگوان کے لئے چپ ہو جاؤ۔

بھاٹیہ:۔ تمہیں میرا بولنا اچھا نہیں لگتا۔ تو میں ابھی خاموش ہو جاتا ہوں۔ میں اپنے ہونٹ بھینچ لیتا ہوں۔ میں اپنے زخموں پر ٹانکے لگا لیتا ہوں (قہقہہ) تم اس سب سامان کو ٹرنک میں بند کر دو صرف یہ بانکیں باہر رہنے دو۔ انہیں رکھ دو میری میز پر۔ اب یہ شاید دو مدقوق کلائیوں کی زینت نہیں بن سکتیں۔ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں۔ یہ معصوم اور بے جان کلیاں۔ ہاں اور اب تم جا سکتی ہو۔

نرس:۔ میں اکیلے کیسے جا سکتی ہوں۔

بھاٹیہ:۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔

نرس:۔ لیکن میں جانا ہی نہیں چاہتی۔ تم آرام کرو۔ میں تمہارے قریب بیٹھتی ہوں۔ تم نے خود کو خواہ مخواہ پریشان کر لیا ہے میں نے تمہیں شروع سے ہی ایک بچہ سمجھا ہے اب مجھے ایک ماں کی طرح اپنے سرہانے بیٹھ کر اپنا سر دبانے دو۔

بھاٹیہ:۔ (ایک آہ بھر کر) میری ماں تو کب کی مر چکی

نرس:۔ ہر عورت اپنے اندر ماں ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے میں بھی ماں ہوں۔

بھاٹیہ (رندھی ہوئی آواز سے) ماں!

نرس (روتے ہوئے) بیٹا!

چوتھا منظر:۔

ہسپتال کا صحن۔ درمیان میں ایک بڑی سی میز لگی ہے جس کے گرد ڈاکٹروں کے لئے کرسیاں لگائی گئی ہیں ایک دیہاتی بڑھیا کسی مریضہ کی چارپائی اٹھوائے اندر داخل ہوتی ہے۔ بڑھیا کا چہرہ جھریوں سے اٹا پڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں اُس کا لباس میلا اور پھٹا ہوا ہے۔ اُس کی آواز میں نقاہت اور کپکپی ہے۔ مریضہ دق کی آخری منزل پر ہے اور سوکھ کر کانٹا ہو چکی ہے۔ ہسپتال کے بڑے گیٹ پر ڈاکٹر بھاٹیہ کی کار رکتی ہے۔ اور وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ "بڑا ڈاکٹر آ گیا، آ گیا بڑا ڈاکٹر" صحن میں بیٹھے ہوئے مریضوں کے مختصر گروہوں کی ملی جلی آوازیں گونجتی ہیں۔

بڑھیا:۔ (منت بھرے لہجے میں) ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے میری بہو کو دیکھنا۔

بھاٹیہ:۔ کہاں ہے تمہاری بہو مائی۔

بڑھیا:۔ چارپائی اٹھوا کر لائی ہوں۔

بھاٹیہ:۔ (مریضہ کی چارپائی کے قریب جا کر) کیا نام ہے تمہارا۔

پشپا:۔ (آہستہ سے) پشپا

بھاٹیہ:۔ (حافظہ پر زور ڈال کر) پشپا۔

بڑھیا:۔ جی ہاں۔ یہ اس کی سسرال کا نام ہے۔

بھاٹیہ:۔ کہاں سے آئی ہو تم؟

بڑھیا:۔ دور کے ایک گاؤں سے۔ بہت تعریف سنی ہے آپ کی اب میری بچی پر بھی دیا کرو۔ میرے پاس امانت ہے یہ۔

بھاٹیہ:۔ امانت، امانت کس کی؟

بڑھیا:۔ یہ میرے لڑکے کی گھر والی ہے۔ وہ فوج میں سپاہی ہے۔

بھاٹیہ:۔ (کچھ سوچ کر) کیا نام ہے تمہارے لڑکے کا؟

بڑھیا:۔ جیراتی لال۔

بھاٹیہ:۔ اُف (فوراً سنبھلتے ہوئے) ہم تمہاری امانت کو سنبھال کر رکھیں گے۔

بڑھیا:۔ اس کے ہاں ایک بچہ ہوا تھا۔ بچہ کچھ دنوں کے بعد

مرگیا۔ اور اسے بخار ہونے لگا۔ پانچ چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ اس کی بیماری کو۔ بیچاری سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔

بھاٹیہ :- (نرس کو پکارتا ہے) نرس۔

نرس :- جی صاحب۔

بھاٹیہ :- پتہ کرو کونسا اسپیشل وارڈ خالی ہے۔ اگر کوئی خالی ہو تو اس عورت کو وہاں داخل کرو۔ (بڑھیا سے مخاطب ہو کر) تمہاری بہو کو ہم ہسپتال میں داخل کر لیتے ہیں۔ یہیں اس کا علاج کرینگے۔

بڑھیا :- جیسے آپ کی مرضی۔ میرا بھی اسکے بغیر کون ہے۔ لے بھگوان اس کا روگ مجھے لگ جائے۔

بھاٹیہ :- (نرس سے) ان دونوں کا کھانا میرے ہاں سے آیا کریگا۔

نرس :- بہت اچھا۔

بھاٹیہ :- بیمار کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اسے مکمل آرام کرنے دو۔

بڑھیا :- اچھی ہو جائے گی میری بہو۔

بھاٹیہ :- ہم کوشش کرینگے۔ شفا بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ تم بھی اُس کی خدمت کرو۔ خدمت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

بڑھیا :- (متفکرانہ لہجہ میں) ایشور تمہارا بھلا کرے۔

پانچواں منظر :-

ڈاکٹر بھاٹیہ کا ڈرائنگ روم۔ ڈاکٹر کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار ہیں۔ وہ اضطراب کی حالت میں کمرے میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اور کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کبھی کبھی آنکھیں اٹھا کر سامنے کی دیوار پر گاڑ دیتا ہے۔ اور لمحہ بھر کے لئے رک کر پھر چکر کاٹنے لگتا ہے۔ مشرقی دروازے کا پردہ اٹھا کر نرس داخل ہوتی ہے۔ اور اُس کی حالت کو دیکھ کر سہم جاتی ہے۔

نرس :- میں نے مریضہ کو سپیشل وارڈ میں داخل کرا دیا ہے۔

بھاٹیہ :- شکریہ۔

نرس :- شکریہ کس بات کا۔

بھاٹیہ :- جانتی ہو یہ عورت کون ہے۔

نرس :- (وقفہ کے بعد) نہیں۔

بھاٹیہ :- یہ عورت اس فوجی سپاہی کی بیوی ہے۔ جس کی شخصیت کا پوسٹ مارٹم ہم دونوں نے رات کے سناٹے میں کیا تھا

نرس :- (حیرت سے) ہیں!

بھاٹیہ :- (سکون سے) ہاں اور اب یہ ہسپتال میں مرنے کیلئے آئی ہے۔ اُس ہسپتال میں جہاں چند روز پہلے اسکا خاوند تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔

نرس :- آپ نے دیکھ لیا مریضہ کو۔

بھاٹیہ :- (آہ بھر کر) ہاں دیکھ لیا۔ وہ دق کی آخری منزل پر ہے۔ جہاں سے زندگی کی بجائے موت کی چوکھٹ زیادہ نزدیک ہے۔ زندگی تک پہونچنے کے لئے جن راہوں سے اُسے گزرنا ہے۔ وہ بہت کٹھن اور پُر پیچ ہیں۔ اُس میں اتنے لمبے سفر کی ہمت نہیں۔ موت تک پہونچنا اُس کے لئے آسان ہے۔

نرس :- تو آپ نے اُسے ہسپتال میں کیوں داخل کر لیا۔ اُسے سینے ٹوریم میں بھیجدیجیگا۔

بھاٹیہ :- میں چاہتا ہوں کہ اسے آرام سے مرنے دوں۔ اسکے جیون کے بجھتے ہوئے دیپک کو جھکڑوں میں رکھنے کی بجائے ہاتھ کی اوٹ دوں۔ اس کی زخمی اور نڈھال زندگی کو ایک دم فنا کی غار میں گرانے کے بجائے آہستہ آہستہ نیچے سرکنے دوں اسکے خون بھرے اعضا کو چٹانوں سے چھلنے نہ دوں۔ میری خواہش ہے۔ کہ اس کی موت ایک المناک حادثہ نہیں۔ فقط ایک معمولی واقعہ بن کر رہ جائے۔

نرس :- مگر دوسرے مریضوں کی بھلائی تو اسی میں ہے۔ کہ مریض کو یہاں نہ رکھا جائے۔

بھاٹیہ :- یہ سوچنا میرا کام ہے تمہارا نہیں۔ اس کا علاج میں خود کرونگا۔ اسکے دوا دارو پر میرا خرچ ہوگا۔ ایک چھوٹے سے واقعہ نے تمہیں نرس سے ماں بنادیا ہے۔ تم نے جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے ذمے ایک کٹھن کام لے لیا ہے اب تمہیں اس کی نہیں بلکہ میری دیکھ بھال کرنی ہے۔ اب تمہیں نرس کے ساتھ ساتھ ماں کے فرائض بھی نبھانے ہیں۔ جس طرح یہ بڑھیا نبھا رہی ہے۔ صبر سے۔ سکون سے۔ ہمت سے

نرس :- جیسے تمہاری مرضی۔

بھاٹیہ :- تم جاؤ اور اس بڑھیا کو تسلی دو۔ کہ اس کی بہو کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی۔ اور یہ ادویات کی فہرست کسی کیمسٹ کے پاس بھجوا دو (نرس جاتی ہے ڈاکٹر اکیلا رہ جاتا ہے)

بھاٹیہ :- (اپنے آپ سے) زندگی کے اس خلا میں جانے ہر روز کتنے ایسے ناٹک کھیلے جاتے ہیں۔ جن کے لئے داد کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس ناٹک میں مجھے بھی حصہ لینا ہے۔ مجھے بھی ایک سوانگ بھرنا ہے۔ جانے کہاں پہونچے گا یہ کھیل۔

چھٹا منظر :-

ہسپتال کا ایک اسپیشل وارڈ۔ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ پشپا کی چارپائی لگی ہے۔ پاس اُس کی ساس بیٹھی ہے۔ پشپا کی حالت زیادہ بگڑ گئی ہے وہ بہت کم بولتی ہے۔ اور جب بھی بولتی ہے۔ تو اُس کی آواز میں نزاع پن سی سلگنے لگتی ہے۔ اُس کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھتی ہیں۔ جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ نرس داخل ہوتی ہے۔

بڑھیا :- بھلا کرے بھگوان تیرا بہن۔ تو میری بہو کی اتنی خدمت کر رہی ہے۔ اگر میری بہو رانی راضی ہو گئیں۔ تو تجھے منہ مانگا انعام دونگی۔

نرس :- (ہنس کر) یہ سب ڈاکٹر کی مہربانی ہے۔

بڑھیا :- بڑا اچھا آدمی ہے ڈاکٹر۔ دیوتا ہے نرا۔ بیچارا کھانا دونوں وقت گھر سے بھجواتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا۔ اگر روپوں کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔

نرس :- پتہ ہے وہ کیوں مہربان ہے تم پر۔

بڑھیا :- میری غریبی پر ترس آگیا ہوگا بے چارے کو۔

نرس :- نہیں یہ بات نہیں۔ تمہارا لڑکا جیرانتی لال اُن کے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ دیکھا بچپن کی دوستی کا کتنا پاس ہے۔ اس شخص کو۔

بڑھیا :- میں قربان اُس پر۔ مگر مجھے تو اُس نے نہیں بتایا۔

نرس :- وہ احسان کرکے جتایا نہیں کرتے۔ وہ خدمت کرنا جانتے ہیں۔ احسان ٹھونسنا نہیں۔

پُشپا :- (دھیمی آواز سے) اُن کے خط بھی آتے ہیں انہیں؟

نرس :- شاید آتے ہوں۔ مجھے معلوم نہیں۔

پُشپا :- کئی روز ہوتے۔ ان کا ایک خط آیا تھا۔ کہ وہ دو چار روز میں برما سے روانہ ہو جائیں گے (کھانستی ہے) نہ تو اب تک وہ خود ہی پہونچے ہیں۔ اور نہ اُن کی کوئی اطلاع ہی آئی ہے (پھر کھانستی ہے) اور اب میں وہ ایک دن کی مہمان ہوں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا آخری وقت نزدیک آگیا ہے۔

بڑھیا :- چپ پگلی ایسا نہیں کہتے۔ تو چند روز میں راضی ہو جائے گی۔

پُشپا :- اب میں راضی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مجھے یقین ہو گیا ہے (کھانستی ہے) میری خواہش تھی۔ کہ مرنے سے پہلے اُن کے درشن ہو جاتے۔ اُن کو ایک بار دیکھ لیتی (دکھی آواز سے) ورنہ میری جان جس عذاب میں ہے۔ وہ میں ہی جانتی ہوں (کھانستی ہے) ہے بھگوان۔

نرس :- ہیں۔ یہ تو بیہوش ہو گئی -!

بڑھیا :- آج صبح سے اس کی حالت پل پل میں بگڑا جاتی ہے۔ ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے اسے۔

نرس :- ٹھہرو میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں (جاتی ہے)

ساتواں منظر :-

ڈاکٹر بھاٹیہ کا ڈرائنگ روم۔ وہ پہلے کی طرح ہی پریشان ہے۔ صوفے میں بیٹھا سگرٹ پی رہا ہے۔ اور کہیں جانے کے خیال سے بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔

نرس داخل ہوتی ہے۔ اُس کا چہرہ اُداس ہے۔ اور اُس کی آواز میں ارتعاش۔

نرس :- ڈاکٹر یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ پشپا کے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ اپنے خاوند کے لئے بے حد پریشان ہے۔ شاید اسی لئے سکون سے مر نہیں سکتی۔ تم اُسے جیراتی لال کی موت کی خبر دیدو۔ اُس کی آس کا سلسلہ تو ٹوٹ جائے۔ وہ ریت کے گھروندے بنانا چھوڑ دے۔ وہ کچی دیوار جس کے سائے میں پڑی وہ ہانپ رہی ہے اب گرا دو۔ اس کا دکھ مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ اُس کی موت نزدیک ہے ڈاکٹر۔

بھاٹیہ :- تم نے دیکھا نہیں نرس۔ اُس کی ساس کتنی خدمت کرتی ہے ہر روز اُس کے کپڑے بدلتی ہے۔ اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔ اُس کی مانگ میں سیندھور بھرتی ہے۔ ابھی کل اُس نے اُسے کانچ کی نئی چوڑیاں چڑھائی ہیں۔ کس طرح سجا کر رکھ رہی ہے۔ وہ اس لاش کو، اپنے بیٹے کی امانت کو، موت کے شکار کو۔

نرس :- بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے۔

بھاٹیہ :- اُسے اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ جانتی ہے پشپا اُس کے آنگن میں لگا گلاب کا پودا ہے۔ جس کو سینچنے والا مالی پردیس گیا ہے۔ اسکو ہرا بھرا رکھنا۔ تر و تازہ اُسکے پھول چننا اسی کا کام ہے۔ اور وہ اپنے فرض کو نبھا رہی ہے۔

نرس :- مگر تم اُسے دھوکے میں کیوں رکھ رہے ہو۔ تم ایک بھاری پاپ کر رہے ہو ڈاکٹر۔

بھاٹیہ :- اسلئے کہ میں اُسے مرنے سے پہلے ایک بیوہ کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس کی مانگ میں زندگی کی سلگتی ہوئی دھیمی آنچ بجھا دی جائے۔ اُس کی کلائیوں میں کھنکتی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کو توڑ کر اُس کی زندگی کو سہاگ کے مدھ بھرے نغمے سے محروم کر دیا جائے۔ اُسکے رنگدار دوپٹے کو ایک سیاہ کفن میں بدل دیا جائے۔

نرس :- یہ تمہاری اپنی محرومی کی بازگشت ہے۔

بھاٹیہ :- شاید۔ آج جانے میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے پشپا کی حالت توقع کے خلاف بگڑ گئی ہے۔

نرس :- وہ کہہ رہی تھی۔ کہ کئی دنوں سے اُسے بُرے بُرے سپنے آ رہے ہیں۔ رات کو سوتے میں کئی دفعہ چیخ اُٹھتی ہے وہ۔

بھاٹیہ :- کوئی موہوم فکر کھائے جا رہی ہے اُسے۔

نرس :- تم اُسے صحیح حالات سے آگاہ کیوں نہیں کر دیتے۔

بھاٹیہ :- نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اُسے بیوہ بنا کر مرنے نہیں دونگا۔ وہ ایک سہاگن کی موت مریگی (آہستہ سے) ایک سہاگن کی موت۔

نرس :- میں تو تمہیں بلانے آئی تھی۔ پشپا کی حالت اچھی نہیں۔

بھاٹیہ :- تو چلو۔ ہاں یہ پیکٹ اٹھا لو۔

آٹھواں منظر :-

وہی اسپیشل وارڈ۔ پشپا کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ نقاہت کے کارن اُس پر غشی کی سی حالت طاری ہے۔ بڑھیا قریب بیٹھی سسک رہی ہے۔

ڈاکٹر بھاٹیہ اور نرس داخل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں سٹیتھو سکوپ بھی نہیں۔ نرس کے ہاتھ میں نیلے سے رنگ کا ایک پیکٹ ہے۔

بڑھیا :- اس کی حالت بہت خراب ہے بیٹا۔ دیکھو کس طرح بے سدھ پڑی ہے۔

بھاٹیہ :- (پشپا کے نزدیک جا کر) پشپا آج جیراتی لال کا خط آیا ہے۔

پشپا :- (چونک کر) کس کا خط۔ اُن کا۔ (جیسے خواب میں بول رہی ہو)

بھاٹیہ :- ہاں وہ عنقریب یہاں پہونچنے والا ہے۔ اور اُس نے تمہارے لئے ایک تحفہ بھیجا ہے۔

بڑھیا :- جُگ جُگ جیؤ بیٹا۔

پشپا :- (ادھ کھلی آنکھوں سے) وہ کب آئیں گے؟

بھاٹیہ :- بہت جلد (نرس سے مخاطب ہوکر) ذرا اس پیکٹ کو تو کھولنا۔

نرس :- (کھول کر) دو چوڑیاں ہیں۔

بڑھیا :- لے بہو تجھے کتنی خواہش تھی چوڑیوں کی۔ بھیج دی ہیں میرے لاڈلے نے۔

بھاٹیہ :- (بڑھیا سے مخاطب ہوکر) لے ماں انہیں پشپا کی کلائیوں میں پہنا دے (نرس سے) اور تو بھاگ کر مسک ان ایتھر کے انجکشن لے آ۔

بڑھیا :- (پیار سے) تیرا سہاگ بنا رہے بیٹی۔ شرم سے آنکھیں بند کیوں کرلیں تونے۔ بڑی شرمیلی ہے میری لاڈو۔

بھاٹیہ :- (آہستہ سے رقت بھرے لہجہ میں) اب یہ سدا کے لئے بند ہوگئی ہیں آنکھیں۔ شرما کے بھاگ گئی ہے۔ تیری لاڈو کھو گئی ہے تیری امانت۔ زندگی ہنس کے آخر موت کے دامن میں چھپ گئی

نرس :- (تیزی سے آتے ہوئے) انجکشن ڈاکٹر۔

بھاٹیہ :- فنشڈ۔

(بڑھیا کے سسکنے کی آواز اُبھرتی ہے۔ اور پھر گردہ گر جاتا ہے)

فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی پائندہ باد،

چنانچہ یہ ۱۹۴۱ء کا سال تھا اور ۱۵ دسمبر کا دن، جاڑے کا موسم پورے جوبن پر تھا، اس سمے جبکہ ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی، اور پیرس، انقلابِ فرانس کا پیرس، کمیون کا پیرس، دریائے سین اور نوتردام کا پیرس ابھی موت اور کہر کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا تو اس وقت چھ گولیوں کی سنسناہٹ نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔

اور گیبریل پیری، وہ پیرس کی طرح حسین اور پیرس کے باغوں کی طرح نفیس پیری دھڑام سے زمین پر آن رہا۔ وہ ترقی پسند ادیب تھا، وہ صحافی تھا، وہ کمیونسٹ تھا، وہ پیری تھا، وہ پیری گیبریل تھا جسے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۱ء کو نازیوں نے گولی سے اڑا دیا تاکہ فرانس کو غلام رکھا جا سکے —

—— لیکن فرانس آزاد ہے،

(بقیہ صفحہ ۵)

پتا تا ہے کہ مصریوں کے مقابلے میں یونانیوں کی عمارتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کنعانیوں کی جہاز سازی اور جہاز رانی کا مداح ہے۔ ہیروڈوٹس یونانی ہونے کے باوجود ہر یونانی چیز کو ہر غیر یونانی چیز پر فوقیت نہیں دیتا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیروڈوٹس عجیب و غریب واقعات کا تذکرہ کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات نظرانداز کر دئے جائیں، تو عام تاریخی سلسل برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح وہ ایسے واقعات کو ابھارتا چلا جاتا ہے۔ جو اس کے "نظریۂ انتقام" کی حمایت کر سکتے ہیں۔

ہیروڈوٹس کی تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ وہ آج سے چوبیس سو سال پہلے کا مورخ ہے۔ اس کی رومان پسندی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے۔ کہ وہ اپنے دور سے جتنا دور چلا جاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ دیومالا پر انحصار کرتا ہے۔ یہ انحصار ہیروڈوٹس کو رومان پسند اور شاعرانہ انداز بیان اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نتائج کے اسباب کی تلاش میں بھی اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶۲)

ہیں کہ اگر دو دن کے لئے بھی قصبے میں آئے تو جال ہے۔ جو کسی عزیز سے نہ ملے۔ اور ایک بدنصیب ہے کہ —— " اور یہ خوش نصیب یہ خاندانی امتیاز قائم رکھنے کے لئے ایسی ایسی خالاؤں کے ہاں جا نکلتا۔ جنہیں پہچاننے کے لئے وہ عملی تین پشتوں کے نسبی شجرے دہرانا پڑھتے

ایم اے کے امتحان کے بعد وہ یہ ارادہ کر کے قصبے میں آیا تھا۔ کہ ایک برس تک وہاں سے کہیں باہر جانے کا نام نہ لے گا۔ اور سولہ برس کی دماغ سوزیوں کے بعد یہ عرصہ مکمل آرام و تسکین سے بسر کرے گا، مگر گھر کے اخراجات نے اُسے ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارنے پر مجبور کر دیا۔ چار بچوں اور ایک بیوی کے علاوہ اُس کے بوڑھے والدین بھی تو تھے، اور پھر شادیاں۔ موت فوت، رسم و رواج، کئی سفارشوں کے بعد اُسے لاہور کے ایک کالج میں فلسفے کا پروفیسر رکھ لیا گیا۔ اور اگرچہ تنخواہ اسی روپے ماہانہ تھی۔ مگر یہ تسلی کافی تھی۔ کہ وہ بیکار نہیں، —— اور پھر اُنہی دنوں اُسے زاہدہ کا ایک خط ملا —— " لڑکی ہوئی ہے، نام تجویز فرمایئے"۔

اُسی روز اُس نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ دیر تک فلسفۂ اولاد کے بارے میں پڑھتا اور سوچتا رہا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر شادی لازمی ہے۔ تو اولاد بھی لازمی ہے، اس لئے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں،

" ریحانہ "، اُس نے ایک فارسی دیوان سے فال نکالی۔ اور پھر گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں ..

(بقیہ صفحہ ۲۷)

راستے بدل رہے تھے۔ اور وہ چلا جا رہا تھا۔ کہیں دور سے ایک آواز اس کے کانوں میں آنے لگی۔ یہ اس مسجد کے موذن کی آواز تھی " اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ جان سے مال سے ...... " مگر یہ آزمائش کب ختم ہوگی؟ شاید یہ ایک ابدی سوال ہے۔ جس کا جواب مالکِ حماقت کے سوائے کچھ نہیں۔ کون جانے انسان کی پوری زندگی ایک آزمائش ہے، شاید یہ ساری کائنات ایک لامتناہی آزمائش ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے جاری ہے۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک کہ اس بوڑھی دنیا کی خمیدہ کمر ٹوٹ نہ جائے۔

آج پہلی مرتبہ وہ یہ نہ بتا سکتا تھا۔ کہ اس کی آزمائش ختم ہو گئی ہے؟ یا شروع ہو رہی ہے؟

جائزہ

چھٹا دریا

چھٹا دریا فکر تونسوی کی ذاتی ڈائری کا نام ہے، یہ ڈائری تاریخ کے اس پُرآشوب دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جب پنجاب کے عوام نیزوں، چھروں، تلواروں اور بموں سے ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا استقبال کر رہے تھے، اور بے بس مظلوم انسان — مرد، عورت، بوڑھے اور بچے اپنے خون کی بھینٹ دے دے کر پنجاب کی سرزمین میں چھٹا دریا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فسادات کا موضوع ہی کم بخت ایسا تھا کہ ہر چھوٹے بڑے ادیب نے اسے اپنانے کی کوشش کی، معدودے چند کی تخلیقات میں کچھ جان اور وزن ہے ان کی کوششیں مستحسن اور قابلِ تعریف ہیں۔ معتدبہ تعداد عصبیت، ابن الوقتی اور تنگ نظری کا شکار ہو گئی۔ اکثر نے اپنی نگارشات میں بے تعصبی، غیر جانبداری اور "ہمہ گیریت" کو سمونا چاہا۔ لیکن شعوری یا لاشعوری طور پر دیانتی کے کلئے قائم کرنے شروع کر دیئے، ان کی تحریروں میں ذرا سا جھول پیدا ہو گیا۔ اور ما نیچے ظاہری خلوص اور رواداری کے باوجود ہیجان اور بے اثر ہو کر رہ گئیں، یہ چیزیں کتنے ہی "خلوص اظہار" اور "شدتِ احساس" کے جذبہ کے تحت معرض وجود میں کیوں نہ آئی ہوں۔ لیکن "خلوصِ اظہار" اور شدتِ احساس" فی نفسہٖ نہایت مبہم، ابہامی اور غیر واضح اصطلاحات ہیں۔ اس احساس اور خلوص کی لفظوں میں تعریف یا حد بندی کرنا بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیکن کم از کم ان کی ایک پہچان تو ہے۔ اور وہ ہے قاری یا سامع کا اثر پذیر ہونا۔ احساس ایک ذاتی اور وجدانی شے ہے، ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ یا حادثہ سے آپ کے دل و دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہو اور ایک دوسرے شخص کو اس کا قطعی علم نہ ہو۔ وہ شخص اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کی مدد سے دوسرے تک منتقل کرتا ہے۔ اور الفاظ کے بیان سے وہی تاثر دوسرے شخص میں پیدا کرتا ہے جو خود صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے بیان کا خلوص پھر ذاتی اور نفسیاتی شے ہے، کوئی بیان بذاتِ خود اپنے جلو میں کتنی ہی صداقت اور خلوص کیوں نہ لئے ہوئے ہو۔ لیکن جب اسے تجربہ، مشاہدہ اور تخیل کے ماحول سے منقطع کر کے قاری یا سامع کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ تو قاری یا سامع کا اتنا ہی اثر پذیر ہونا لازمی نہیں ہے۔ جتنا کہ خود صاحب جذبہ یا صاحب بیان ہوا ہے۔ اور یہی چیز فکر اور فسادات پر قلم اٹھانے والے ادیبوں کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ جہاں دوسرے ادیبوں نے مشاہدہ اور تخیل پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ اور تجربے کی اہمیت کو نظر انداز کر گئے ہیں، وہاں فکر نے تجربہ اور مشاہدہ کے ساتھ ساتھ تخیل کا بھی استعمال کر کے اپنے جذبات و احساسات کی سچی اور صحیح ترجمانی کی ہے، فکر خود اس آگ اور خون کے "گرداب بلاخیز" میں گزرا ہے اور اس نے نہایت دیانتداری اور صفائی سے جو کچھ دیکھا۔ اور محسوس کیا، صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ اس نے اپنے تجربات، احساسات، مشاہدات اور جذبات کو باہم وگر مربوط و منسلک کر کے ایسی قلمی تصویر کھینچی ہے۔ کہ پنجاب کے اس چھٹے دریا کو ہم اس کی ڈائری میں، رواں دواں محسوس کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ وہ ایک چھوٹے کئی مقامات پر حد سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے لیکن اس کے خلوص نے جذباتیت سے مل کر اپنے نوکِ قلم سے ایک ایسا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ آنے والی نسلیں اپنے آبا و اجداد کے کارنامے کا تذکرہ پڑھ کر ابدالآباد لعنت بھیجتی رہیں گی۔

فکر کی ڈائری میں بلا کی تلخی اور طنز ہے، اس کے وار سے کوئی بھی نہیں بچ سکا، لیڈر، سیاسی، ادیب، صحافی، فن کار سب اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ابن الوقتوں اور موقع پرستوں کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا ہے۔ وہ جھنجھلا اٹھا ہے، خدا کے خلاف، مذہب کے خلاف، ہندو کے خلاف، سکھ کے خلاف، مسلمان کے خلاف، ہر اس چیز کے خلاف جس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ فسادات کو شہ ملی ہے۔ لیکن اس گہری اور بے پایاں ظلمت و تاریکی میں بھی کبھی کبھی انسانیت کی مدھم شمع ٹمٹمانے لگتی ہے۔ اور فکر کی آنکھیں مسرت اور خوشی سے چمکنے لگتی ہیں۔ سرکلر روڈ پر ایک بلڈنگ دھڑا دھڑ جل رہی ہے، بلڈنگ کی بالائی منزل

میں ایک ہندو خاندان اقامت پذیر تھا اور نچلی منزل میں کسی بک بائنڈر کی دکان تھی، جہاں ہر روز بیسیوں مزدور مل کر قرآن مجید کی جلد بندی کیا کرتے، دونوں جل رہے تھے، اُوپر ہندو کی منزل اور نیچے مسلمان کا قرآن مجید۔ اوپر کی منزل پر بوہڑ کے ایک بھاری بھرکم گارڈر کے نیچے دبے ہوئے ایک سات آٹھ سالہ بچے کی لاش کو لوگ نکالنے میں مصروف تھے۔ اوپر ہندو کا لڑکا جل رہا تھا اور نیچے خدا کا قانون، ہندو اور مسلمان مل کر آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ آگ نے دو نظریوں کو ایک میدان میں شمادی بخشی، نگر ایسی آگ کا استقبال کرتا ہے اور اس پر فلسفہ، علم اور ادب کے لاکھوں نظریے قربان کر سکتا ہے۔

وہ مہاتما گاندھی کو سلام کرتا ہے جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ کر ہندوؤں اور سکھوں سے کہہ رہا تھا کہ "مسلمان" کو مت مارو، "مسلمان" مارا جا رہا ہے۔ وہ اپنے وطن تونسہ شریف کے پیر نظام الدین کو سلام بھیجتا ہے۔ جن نے اپنے علاقہ کے سارے غیر مسلموں کی حفاظت کر کے اپنی "مسلمانیت" کا ثبوت دے دیا تھا وہ کیمپ کے اس ڈوگرہ محافظ سپاہی پر سلام بھیجتا ہے۔ جو حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود انہیں اپنی زبان پر لانے سے معذور ہے۔ کیونکہ کھرے کھرے لکھے ہی لکھے اُسے نوکری سے علیحدہ ہونا پڑتا۔

نگر کی ڈائری سے ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ اکیلا ہی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا تھا، بلکہ اسکے دوست اور ساتھی بھی بے حد جذباتی تھے۔ لیکن ایسا ہونا فطری اور بدیہی امر تھا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ کم و بیش ہر انسان میں جذباتیت کے جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ لیکن جذباتی ہونے کے باوجود اسکے دوست عام روش کے برعکس انسانیت کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ اور اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ایک ہندو (جو صرف دوسروں کی نظر میں لیکن نگر کے نزدیک اسکے لئے یہ سب سے بڑی گالی ہے کہ اسے انسان کی بجائے ہندو کہہ دیا جائے) کی وضاحت کرتے رہے۔ خود دھمکیوں سے دوچار ہوئے۔ لیکن آخر وقت تک اپنے مسلک پر قائم رہے۔ پھر ایسے حالات میں جبکہ عارف کا باپ امرتسر میں گھرا ہوا تھا، ممتاز کا "اچا" بٹالہ میں ہندوؤں سکھوں کے رحم و کرم پر تھا، ساحر اپنی آنکھوں سے دہلی کے مسلمانوں کی بربادی دیکھ کر آیا تھا اور قتیل کے دو عزیزوں کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ مولوی صلاح الدین احمد کا مکان غنڈوں نے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ ایک کافر کو قتل کر کے اپنا نام غازیوں کی فہرست میں لکھوا لیتے۔

واقعات کی ترتیب میں نگر سے بہت سی فروگذاشتیں ہو گئی ہیں۔ بعض بعض جگہ تو یہ غلطیاں بہت بری طرح کھٹکتی ہیں اور ہمیں تصنع اور بناوٹ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ریڈکلف کا ایوارڈ ریڈیو پاکستان سے ۱۷ اگست کو شام کے چھ بجے نشر کیا جاتا ہے۔ لیکن نگر اسے ۱۹ اگست کو ریڈیو پر سنتا ہے۔ ساحر کہتا ہے کہ میں نے اپنی نظم "آج" ۱۱ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو دہلی کی نشرگاہ سے سُنائی۔ لیکن نگر اسے ۷ ستمبر ہی کو سن لیتا ہے۔ نگر کی ڈائری کہتی ہے کہ ۲۴ اکتوبر کو قائدِ اعظم نے لاہور میں لاکھوں کے مجمع میں تقریر کی اور یک لخت کیمونسٹ بن جانے والے شاعر نے ان کے استقبال میں ایک نظم پڑھی تھی، نگر، ساحر اور دوسرے ساتھی ریڈیو پر اسے سُن بھی لیتے ہیں اور قائدِ اعظم ۲۴ اکتوبر کو کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کر رہے ہوتے ہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ نگر کی ڈائری کے مطابق ۳ نومبر کو قائدِ اعظم پھر لاہور میں تقریر کرتے ہیں اور فردوسیِ اسلام دوبارہ اپنی استقبالیہ نظم پڑھتے ہیں۔ نگر اپنے دوستوں اور ساتھیوں سمیت دوبارہ اس تقریر کو سنتے ہیں اور نظم پر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اگر نگر واقعاتی تسلسل، ربط اور توازن قائم رکھ سکتا۔ تو ڈائری کی اہمیت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ اور اسے ایک تاریخی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ تاہم یہ ضمنی اور فروعی باتیں ہیں۔ ہمیں لکھنے والے کے خلوص اور دیانتداری پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیئے۔

کتاب کا دیباچہ سہیل عظیم آبادی کا ہے، اور وہ اصل کتاب سے بھی زیادہ جذباتی لکھا گیا ہے، دیباچے میں تقسیم ہند کی مخالفت کی گئی ہے۔ اور بالواسطہ فسادات کی ذمہ داری پاکستان کے سر منڈھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ دیباچہ نگار کے نظریئے کے مطابق تقسیم ہی سارے فساد کی جڑ ہے میرے خیال میں اگر یہ دیباچہ نہ بھی ہوتا تو کتاب کی "افادیت" میں کوئی فرق نہ آتا۔

(حمید الحق)

★ باری

اخلاقیات اس امر پر بحث کرتی ہے۔ کہ انسان کو کیسا ہونا چاہئے جب معاشرے کا معاشی تعاول قائم نہیں رہتا تو اسوقت اخلاقی بنا پر یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس معاشی تعاول یا توازن کو مجلسی عدل کے اصولوں کے مطابق نئے انداز میں قائم کیا جائے۔ سیاسیات کا کام فرد اور ریاست کے تعلقات کا مطالعہ ہی افراد ی معاشی سرگرمیوں اور ریاست کی عمومی سرگرمیوں میں گہرا تعلق ہوتا جاتا ہے

(باری)